

۷۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

ترجمہ قرآن شریف

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اردو ترجمہ سانی

ظہور الباری عظیمی

پارہ اول کا جزء دوم

شائع کردہ
مکتبہ عثمانیہ 2280 مینا بازار
پورالہور بخش کالونی کراچی 5

بیت الحکمت دیوبند (یو۔ پی)

(جملہ حقوق بنام بیت الحکمت محفوظ ہیں)

قیمت دو روپے

2/50

ضروری اعلان

جزء اول کی وصولیابی کے بعد بعض ممبران نے دفتر کو یہ شکایت لکھی ہے کہ تفسیر ابن جریر کا پورا پارہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ چونکہ تفسیر ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے، خصوصاً سورہ بقرہ جو ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے، کی تفسیر بعض جگہ وصیائے کی وجہ سے بہت مفصل ہے۔ اس لئے ابتداء کے تین پاروں میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ پورا پارہ ایک قسط میں ممبران کو بھیجا جاسکے۔ ہم نے پروگرام کے اعلان و اشاعت کے وقت اس کی وضاحت کر دی تھی کہ ہر قسط اوسطاً سو صفحات کی ہوگی۔ ایک روپیہ چار آنے اس کی قیمت بھی متعین کر دی تھی اور اس پر جو ڈاک خرچ پڑتا اس کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ ادھر پہلا پارہ ڈھائی سو صفحہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا قیمت اور ڈاک خرچ پر ممبران کو پورا پارہ دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ پہلا پارہ اگر پورا شائع کر دیا جائے تو سواروپیہ سے زیادہ صرف ڈاک خرچ پر لگ جائے گا۔ اس لئے سابقہ اعلان کے مطابق اپنی اور ممبران کی سہولت کے لئے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ شروع کے تین پاروں کو مجموعی طور پر چھ اجزاء میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں پوری امید ہے کہ آئندہ کی باقی قسطوں میں ہر قسط پورے پارہ ہی کی رہے گی۔ انشاء اللہ پورا کتابچہ چونتیس یا پینتیس قسطوں میں شائع کیا جاسکے گا۔

ہم نے جب شروع میں پروگرام کا اعلان کیا تھا تو دی۔ پی کا خرچ آج کل سے کم تھا۔ اس کے بعد دی۔ پی کا خرچ بھی کچھ بڑھ گیا اور کاغذ بھی گراں ہو گیا۔ لیکن ہم نے ممبران کے لئے قیمت وغیرہ میں اضافہ مناسب نہیں سمجھا تا کہ کوئی ممبر بار نہ محسوس کرے۔ ہم اپنے تمام ممبران سے اپیل کرتے ہیں کہ جب کہ وہ خود اس کے ممبر بن گئے ہیں تو ان مجید کی نشر و اشاعت اور دو سہ روزہ دینی بھائیوں تک اسے پہنچانے اور ممبر بنانے میں بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں۔

منجبر

DATA ENTERED ✓

۷۸۶

۲۹۷۵۱۶

۱۲۳۱

۱۳۳۹۶

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان NO 2	نمبر شمار
۲۸	اصول فقہ کا ایک مسئلہ۔	۲۶	۵	وعدہ ملاقات۔	۱
۲۹	تیسری شرط	۲۷	۶	ایک نیا مشغلہ۔	۲
۵۱	قیمت ایک گائے کی!	۲۸	۸	اسے بھی معاف کیا۔	۳
۵۱	اللہ کی قدرت کے مظاہر	۲۹	۸	کتاب و فرقان۔	۴
۵۳	سبق	۳۰	۹	توبہ	۵
۵۲	بدبختی نے تمہارا پچھپا نہ چھوڑا۔	۳۱	۱۱	معاندانہ روش	۶
۵۵	کلمہ "اد" کی تحقیق۔	۳۲	۱۲	دوبارہ زندگی	۷
۵۶	پتھر بھی سپیچ جانتا ہے	۳۳	۱۵	بادل کا سایہ۔	۸
۵۷	ان سے ایمان کی توقع ہے!	۳۴	۱۶	من و سلوی	۹
۶۰	منافقین یہود	۳۵	۱۶	واقعہ کی تفصیل	۱۰
۶۳	لکیر کے فقیر	۳۶	۱۸	بستی میں داخلہ کا حکم	۱۱
۶۵	تباہی کے راستے پر	۳۷	۲۰	حکم عدولی	۱۲
۶۷	بے بنیاد دعویٰ	۳۸	۲۰	عذاب	۱۳
۶۹	قانون جزا و سزا۔	۳۹	۲۱	موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ	۱۴
۷۰	توحید اور عمل صالح کا عہد	۴۰	۲۳	نیا مطالبہ۔	۱۵
۷۲	اس سے بھی پھر گئے	۴۱	۲۶	ذلت و محتاجی کا عذاب	۱۶
۷۳	ایک اور عہد اور اس کی خلاف ورزی۔	۴۲	۳۲	میتاق۔	۱۷
۷۷	کتاب الہی، بیانات اور روح القدس	۴۳	۳۵	فہمائش	۱۸
۷۸	تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو	۴۴	۳۵	پھر وہی تلون	۱۹
۷۹	یہ دعویٰ!	۴۵	۳۷	حی سے تجاوز	۲۰
۸۰	اللہ کی لعنت کے مظاہر	۴۶	۴۰	عذاب	۲۱
۸۰	دیباہہ دلیری	۴۷	۴۱	خوف خدا رکھنے والوں کے لئے نصیحت	۲۲
۸۲	ازکار کی وجہ صرف حسد ہے۔	۴۸	۴۳	گائے ذبح کرنے کا حکم۔	۲۳
۸۳	غضب بالائے غضب	۴۹	۴۴	گائے کیسی ہو؟	۲۴
۸۴	یہ بھی کوئی جواب ہے۔	۵۰	۴۴	بال کی کھال۔	۲۵

ضروری اعلان

جزء اول کی وصولیابی کے بعد بعض ممبران نے دفتر کو یہ شکایت لکھی ہے کہ تفسیر ابن جریر کا پورا پارہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ چونکہ تفسیر ابن جریر ایک طویل تفسیر ہے، خصوصاً سورہ بقرہ جو ڈھائی پاروں پر مشتمل ہے، کی تفسیر بعض خصوصیات کی وجہ سے بہت مفصل ہے۔ اس لئے ابتداء کے تین پاروں میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ پورا پارہ ایک قسط میں ممبران کو بھیجا جاسکے۔ ہم نے پروگرام کے اعلان و اشاعت کے وقت اس کی وضاحت کر دی تھی کہ ہر قسط اوسطاً سو صفحات کی ہوگی۔ ایک روپیہ چار آنے اس کی قیمت بھی متعین کر دی تھی اور اس پر جو ڈاک خرچ پڑتا اس کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ ادھر پہلا پارہ ڈھائی سو صفحہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا قیمت اور ڈاک خرچ پر ممبران کو پورا پارہ دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ پہلا پارہ اگر پورا شائع کر دیا جائے تو سوار روپیہ سے زیادہ صرف ڈاک خرچ پر لگ جائے گا۔ اس لئے سابقہ اعلان کے مطابق اپنی اور ممبران کی سہولت کے لئے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ شروع کے تین پاروں کو مجموعی طور پر چھ اجزاء میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں پوری امیر ہے کہ آئندہ کی باقی قسطوں میں ہر قسط پورے پارہ ہی کی رہے گی۔ انشاء اللہ پورا تہ آن مجید چونتیس یا پینتیس قسطوں میں شائع کیا جاسکے گا۔

ہم نے جب شروع میں پروگرام کا اعلان کیا تھا تو دی۔ پی کا خرچ آج کل سے کم تھا۔ اس کے بعد دی۔ پی کا خرچ بھی کچھ بڑھ گیا اور کاغذ بھی گراں ہو گیا۔ لیکن ہم نے ممبران کے لئے قیمت وغیرہ میں اضافہ مناسب نہیں سمجھا تا کہ کوئی ممبر بارہ محسوس کرے۔ ہم اپنے تمام ممبران سے اپیل کرتے ہیں کہ جب کہ وہ خود اس کے ممبر بن گئے ہیں تو وہ ان مجید کی نشر و اشاعت اور دو سہز دینی بھائیوں تک اسے پہنچانے اور ممبر بنانے میں بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں۔

منجبر

DATA ENTERED ✓

۷۸۶

۲۹۷۵۱۹

۱۲۳۱

۱۳۳۹۹

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۲۸	اصول فقہ کا ایک مسئلہ۔	۲۶	۵	وعدہ ملاقات۔	۱
۲۹	تیسری شرط	۲۷	۶	ایک نیا مشغلہ۔	۲
۵۱	قیمت ایک گائے کی!	۲۸	۸	اسے بھی معاف کیا۔	۳
۵۱	اللہ کی قدرت کے مظاہر	۲۹	۸	کتاب و فرقان۔	۴
۵۳	سبق	۳۰	۹	توبہ	۵
۵۲	بڑبختی نے تمہارا پچھتاؤ نہ چھوڑا۔	۳۱	۱۱	معاندانہ روش	۶
۵۵	کلمہ "او" کی تحقیق۔	۳۲	۱۲	دوبارہ زندگی	۷
۵۶	پتھر بھی سپیچ جانتا ہے	۳۳	۱۵	بادل کا سایہ۔	۸
۵۷	ان سے ایمان کی توقع ہے!	۳۴	۱۶	من و سلوٰمی	۹
۶۰	منافقین یہود	۳۵	۱۶	واقعہ کی تفصیل	۱۰
۶۳	لکیر کے فقیر	۳۶	۱۸	بستی میں داخلہ کا حکم	۱۱
۶۵	تباہی کے راستے پر	۳۷	۲۰	حکم عدولی	۱۲
۶۶	بے بنیاد دعویٰ	۳۸	۲۰	عذاب	۱۳
۶۹	قانون جزا و سزا۔	۳۹	۲۱	موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ	۱۴
۷۰	توحید اور عمل صالح کا عہد	۴۰	۲۳	نیا مطالبہ۔	۱۵
۷۲	اس سے بھی پھر گئے	۴۱	۲۶	ذلت و محتاجی کا عذاب	۱۶
۷۳	ایک اور عہد اور اس کی خلاف ورزی۔	۴۲	۳۲	میشاق۔	۱۷
۷۷	کتاب الہی، بیانات اور روح القدس	۴۳	۳۵	فہمائش	۱۸
۷۸	تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو	۴۴	۳۵	پھر وہی تلون	۱۹
۷۹	یہ دعویٰ!	۴۵	۳۷	حیث سے تجاوز	۲۰
۸۰	اللہ کی لعنت کے مظاہر	۴۶	۴۰	عذاب	۲۱
۸۰	دیباچہ دلیری	۴۷	۴۱	خوف خدا رکھنے والوں کے لئے نصیحت	۲۲
۸۲	ازکار کی وجہ صرف حسد ہے۔	۴۸	۴۳	گائے ذبح کرنے کا حکم۔	۲۳
۸۳	غضب بالائے غضب	۴۹	۴۴	گائے کیسی ہو؟	۲۴
۸۴	یہ بھی کوئی جواب ہے۔	۵۰	۴۴	بال کی کھال۔	۲۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵۱	کھلے ہوئے معجزات کا انکار	۸۵	۵۴	جبریل علیہ السلام سے دشمنی	۹۰
۵۲	موت کی آرزو کر کے دیکھو	۸۷	۵۵	الشکافروں کا دشمن ہے	۹۳
۵۳	دل کا پتھر	۸۹	۵۶	روشن نشانات کا انکارنا فرمان ہی کر سکتا ہے۔	۹۴

ایک قابل مطالعہ کتاب

”آلات جدیدہ“

از مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی

اس کتاب میں نئی ایجادات مثلاً لائوڈ سپیکر، گراموفون، ریڈیو، فوٹو گرافی، انجکشن اور اس کے علاوہ بہت سے آلات کے استعمال اور ان کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ لائوڈ سپیکر پر اذان اور نماز جائز ہے یا نہیں؟ ریڈیو پر قرآن مجید کی تلاوت، تفسیر یا دوسری دینی باتیں بیان کرنے کا کیا حکم ہے۔ گراموفون کی شرعی حیثیت ٹیلی فون، ریڈیو کی خبر کا حکم۔ انپیر اگر کسی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی تو کیا سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جائے گا؟ سینما اور فوٹو گرافی کا حکم، انجکشن کے احکام۔ کیا انجکشن سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔؟

یہ اور اس کے علاوہ آلات جدیدہ سے متعلق اور بہت سے احکام و دلائل عقلی و نقلی کے ساتھ پوری تفصیل سے آپ کو اس کتاب میں ملیں گے۔ یہ کتاب ہر خاص و عام کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے اور سب کے لئے بہترین رہنما ہے۔

کتابت و طباعت عمرہ۔ قیمت ڈھائی روپے

ملنے کا پتہ

بیت الحکمت دیوبند (یو۔ پی)

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ أَخَذْنَا الْعَجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ

اور دوزخ میں لیا گیا اور جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا۔ پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا کہ سالہ کو موسیٰ کے (جانے کے) بعد اور تم نے

ظَلْمُونَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَإِذْ

ظلم یہ کرنا بند رکھی تھی۔ پھر بھی ہم نے تمھارے (توبہ کرنے پر) اور گذر کیا تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے اور دوزخ میں لیا گیا

اتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب (توریت) اور فیصلہ کی چیز اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو

وعدہ ملاقات

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً (اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کر لیا تھا) ایک قراءت تو یہی ”وَعَدْنَا“ ہے (مفاعلتہ سے) یعنی اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام نے باہم عہد و پیمانہ کر لیا تھا۔

اس کی دوسری قراءت ”وَعَدْنَا“ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا۔ پہلی قراءت کی بنیاد پر دونوں طرف سے وعدہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ طور پر ان سے مناجات کرے گا، اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حاضری کی سعادت کا اظہار خوشی سے کیا تھا۔ دونوں قراءتیں اپنی اپنی جگہ درست اور حق ہیں۔ لفظ موسیٰ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے، دو الفاظ سے مرکب ہے۔ ”ماء“ (پانی) اور ”شجر“ (درخت) گو یا ”مو“ ماء سے ہے اور ”سی“ شجر سے ہے۔ آپ کا نام اس لئے پڑا جیسا کہ ہم نے سنا ہے کہ جب آپ کی والدہ نے اللہ کی وحی کے مطابق فرعون کے خوف سے آپ کو تابوت میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا تو آپ کو آپ کی والدہ نے ڈالا تھا۔ تو موجوں کے تھپیروں نے آپ کے تابوت کو ان درختوں کی شاخوں میں لے جا کر الجھا دیا جو فرعون کے محل سے لگے ہوئے تھے۔ فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا کی باندیاں غسل کرنے کے لئے نکلیں تو تابوت انھیں ملا، انھوں نے اسے اٹھالیا۔ چونکہ اس جگہ پانی اور درخت تھے، اس لئے آپ کو ”ماء و شجر“ پانی اور درخت یعنی موسیٰ، کہا جانے لگا۔

سدی رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے ”موسیٰ بن عمران بن یہر بن داہب بن لاوی بن یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام۔“

”اربعین لیلۃ“ (چالیس راتوں کا) ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جن چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا وہ یقیناً وہی ہے اور اسے مہینہ اور دس دن کی الجھنک کی رائیں تھیں۔ اسی موقع پر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم پر ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر آئے تھے اور چالیس دن تک طور پر پہاڑی پر قیام کیا تھا، وہیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر تو رات، الواح پر نازل کی یہ الواح ”برزخ“ کی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرگوشی کے لئے قریب بلا یا اور آپ سے گفتگو کی اور آپ نے (لوح محفوظ میں) قلم چلنے کی آواز سنی۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس پورے چالیس دن میں آپ کی وضو نہیں لوٹی، یہاں تک کہ آپ طو سے اتر آئے۔

ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، تیس راتوں کا اور اضافہ کر دیا، اور اس طرح اللہ کی میقات چالیس راتوں میں پوری ہوئی۔ اس عرصہ کے لئے

موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر اپنا نائب بنا کر گئے تھے اور فرمایا تھا کہ اپنے رب کے حضور میں جلدی پہنچنا چاہتا ہوں تم میرے نائب کی حیثیت سے میری قوم کی نگرانی کرنا اور فساد پر پا کرنے والوں کی پیروی نہ کرنا۔

چنانچہ آپ اپنے رب سے ملاقات کے شوق میں بہت عجلت کے ساتھ روانہ ہوئے، ہارون علیہ السلام نائب کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے ساتھ رہے۔ سامری بھی آپ کے ساتھ تھا اور وہ بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کے نقش قدم پر لے جانے لگا۔ تاکہ آپ کے پاس انھیں لے جائے۔

سدی رحمتہ اللہ علیہ سے بھی اس روایت کا ابتدائی حوالہ منقول ہے۔

ایک نیا مشغلہ

سخت ظالم تھے، یعنی جن دنوں موسیٰ علیہ السلام وعدہ کے مطابق گئے ہوئے تھے تم نے ان کی عدم موجودگی میں گو سالہ کو اختیار کر لیا تھا یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہودی مخالفین کو تنبیہ کی ہے کہ نبی کو جھٹلانا، اور ان کی مخالفت کرنا تمھارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے تمھارے آباء اور اسلاف نے بھی انبیاء کو جھٹلایا تھا حالانکہ مسلسل اللہ تعالیٰ کے انعامات ان پر ہوتے رہتے تھے۔ پس اگر اپنے اسلاف کی طرح تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے ہو اور ان کی سچائی اور صداقت کے علم کے باوجود ان کی رسالت کا انکار کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ سطوت اور اس کے غضب سے محفوظ نہیں رہ سکتے کہ انبیاء کو جھٹلانے والے اور ان کی تکذیب کرنے والے تمھارے اسلاف پر بھی خدا کا عذاب مسخ، لعنت اور مختلف قسم کی ذلتوں کی صورت میں نازل ہو چکا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرتے ہوئے) فرعون اپنے لشکر کے ساتھ سمندر پر پہنچ چکا تھا، اس وقت وہ ایک بڑے گھوڑے پر سوار تھا۔ سمندر کے کنارے تک پہنچ گیا، لیکن اس میں بنے ہوئے راستے پر گھوڑے کو چلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام ایک مادہ گھوڑی پر سوار ظاہر ہوئے، جب گھوڑے نے اُسے دیکھا، تو اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بیان کیا کہ سامری نے (جو بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا) جبریل علیہ السلام کو پہچان لیا، کیونکہ اس کی پیدائش کے بعد اس کی ماں کو خطرہ ہوا کہ اب یہ بھی (فرعون) حکم کے مطابق قتل کر دیا جائے گا تو اسے ایک غار میں چھوڑ آئی تھی اور غار کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام آتے تھے اور اپنی انگلیوں سے اسے غذا دیتے تھے، سامری کو آپ کی بعض انگلی سے دودھ، بعض سے شہد اور بعض سے گھی ملتا تھا، یونہی آپ اسے کھلاتے پلاتے رہے اور اسے بڑا کیا، چنانچہ جب اس نے آپ کو سمندر میں دیکھا تو پہچان گیا اور آپ کے گھوڑے کے کھڑکے پیچھے سے ایک مٹھی مٹی اٹھالی۔ اس کی سمجھ میں یہ آ گیا تھا کہ اس مٹی کو جس چیز پر بھی ڈالا جائے اور چا یا جائے کہ یہ فلاں چیز بن جائے تو وہ ویسی ہی ہو جاتی ہے وہ مٹی یونہی اس کے ہاتھ میں رہی، تا آنکہ اس نے سمندر پار کر لیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سمندر کو پار کر گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے لشکر کو غرقاب کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ میری قوم کی نگرانی میرے نائب کی حیثیت سے کرتے رہنا اور ان کی اصلاح کا خیال رکھنا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے وعدہ کے مطابق (کوہ طور کے لئے) روانہ ہوئے بنی اسرائیل کے پاس فرعونیوں کا ایک زبور تھا جسے انھوں نے چھپا دیا تھا۔ غالباً اس کی اپنے ساتھ موجودگی کو گناہ خیال کر کے انھوں نے اسے نکالا، تاکہ آگ آ کر اسے جلا جائے۔ لیکن جب تمام بنی اسرائیل اس کے لئے جمع ہوئے تو سامری نے مٹھی کی

لے پھیلی امتوں میں مال غنیمت کے ساتھ ہی طرز عمل اختیار کیا جاتا تھا۔ اس کا استعمال صرف اس آخری امت کیلئے جائز قرار دیا گیا ہے، ورنہ پہلے یہ طریقہ تھا کہ اُسے میدان میں رکھ دیتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگ آتی اور اسے جلا کر خاکستر کر جاتی (منترجم)

مٹی اس زیور پر پھینک کر کہا کہ گو سالہ ہو جاوے ایک ایسا جسم جس میں آواز ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہو اس گو سالہ کے پیچھے سے داخل ہوتی اور آگے سے نکل جاتی، اور اس سے ایک آواز پیدا ہوتی تھی۔ سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ تمہارا اور موسیٰ کا محبوب ہے۔ چنانچہ تمام یہودی اسی گو سالہ کی پرستش کرنے لگے۔ اس پر بارون علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ ”اے قوم کے لوگو! تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، تمہارا رب تو رحمن ہے، میری انباغ کرو اور میری بات مانو“ لیکن بنی اسرائیل نے یہ جواب دیا کہ ہم اس گو سالہ کی پرستش کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس واپس لوٹ آئیں۔

سدری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سرزمین مصر سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو آپ نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ وہ آپ کے ساتھ یہاں سے نکل چلیں، آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ قبیلوں کے یہاں سے کچھ زیورات عاریت کے طور پر لے لیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات دی اور فرعون کو غرقاب کیا تو جبریل علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے پاس آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں لے جانے کے لئے آئے۔ آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے، جب سامری نے اسے دیکھا تو اسے اس میں انفرادیت نظر آئی، اور اس نے کہا کہ یہ ”فرس حیات“ (زندگی کا گھوڑا) ہے، اس نے گھوڑے کو دیکھ کر کہا کہ اس کی تو ایک زالی شان ہے پھر اس نے گھوڑے کے کھڑکے پیچھے سے مٹی اٹھالی اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام روانہ ہوئے اور بارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل پر اپنا نائب مقرر کیا۔ ان سے آپ تیس راتوں کا وعدہ کر کے گئے تھے کہ یہ مدت گزار کر واپس آجائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں دشمن کا اور اضافہ کر دیا۔ پھر بارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ غنیمت کا استعمال تمہارے لئے جائز نہیں ہے اور قبیلوں کے زیورات بھی مال غنیمت کے حکم میں ہیں، اس لئے قبیلوں کے جتنے زیورات تمہارے پاس ہیں انہیں جمع کر لو، اور ایک گڑھا کھود کے اس میں اسے گاڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے واپس آ کر اسکا استعمال تمہارے لئے جائز کر دیا تو استعمال کر لینا اور اگر جائز نہیں قرار دیا تو یونہی چھوڑ دینا چنانچہ ایک گڑھے میں انہوں نے قبیلوں کے تمام زیورات ڈال دیئے، اتنے میں سامری آیا اور اس نے وہی مٹی بھر مٹی ان زیورات پر پھینکی، اس سے اللہ تعالیٰ نے ان زیورات سے ایک گو سالہ پیدا کر دیا جس کے جسم بے جان سے آواز نکلتی تھی۔

ادھر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کی تاریخ کو یوں شمار کرنا شروع کیا کہ دن کو تو ایک دن شمار کرتے ہی تھے، رات کو بھی ایک مستقل دن کی حیثیت سے شمار کرنا شروع کر دیا۔ پھر بیسویں دن گو سالہ نکل کے باہر آ گیا۔ جب بنی اسرائیل نے بھی اسے دیکھ لیا تو سامری نے ان سے کہا کہ تمہارا اور موسیٰ کا محبوب تو یہی ہے، کہنے لگا کہ موسیٰ (علیہ السلام) اپنے محبوب کو یہاں چھوڑ کر تلاش کرنے دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ اب کیا تھا، بنی اسرائیل نے اس کی عبادت شروع کر دی۔

وہ گو سالہ چل پھر سکتا تھا۔ بارون علیہ السلام نے انہیں بہت سمجھایا کہ اے بنی اسرائیل! تم اس گو سالہ کی وجہ سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو، تمہارا رب تو رحمن ہے، لیکن انہوں نے نہ مانا، بارون علیہ السلام اور آپ کے ساتھ جو بنی اسرائیل (حق پر تھے) انہوں نے گو سالہ پرستوں سے اس مسئلہ پر لڑائی اور جنگ نہیں کی۔

موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے حضور میں گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہو چکے تھے۔ جب اللہ نے آپ کو اپنے کلام سے نوازا تو یہی دریافت فرمایا کہ موسیٰ! اپنی قوم کے پاس سے آپ اتنی جلدی کیوں آئے؟ عرض کی کہ میری قوم میرے پیچھے آرہی ہے، اور اے میرے رب! میں نے جلدی اس لئے کی تاکہ آپ راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہارے آنے کے بعد تمہاری قوم کو فتنہ میں ڈال دیا، اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ پھر ان کا تمام واقعہ آپ کو بتایا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ سامری کا تعلق ”باہرہ ما“ کے قبیلہ سے تھا، اس قبیلہ کے لوگ گائے کی پوجا کیا کرتے تھے، اس لئے گائے کی محبت اس کے دل میں پہلے ہی سے تھی، پھر اس نے بنی اسرائیل میں آ کر اسلام

کا اظہار کیا تھا۔ اس روایت میں ہے کہ زیورات کو جلانے کے لئے ہارون علیہ السلام نے آگ جلوالی تھی۔ سامری کا نام موسیٰ بن ظفر تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں بھی تقریباً اسی طرح واقعہ بیان ہوا ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے۔

”وَ اَنْتُمْ ظَلِمْتُمْ“ یعنی تم اس کی عبادت کرنے لگے جو عبادت کے لائق نہیں تھا۔ کیونکہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تم نے گو سالہ کی عبادت شروع کر دی، یہ تمہارا ظلم اور حد سے تجاوز تھا۔ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ ”ظلم“ کا اصل مفہوم ہے ”کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا“ اس لئے اب یہاں ہم اس کی تفصیل نہیں کریں گے۔

اسے بھی معاف کیا

کر دیا کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ، یعنی تمہاری گو سالہ پرستی کے بعد (صرف ایک خاص گروہ کو سزا دیکر) ہم نے معاف کر دیا اور (عام) سزا نہیں دی۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ تمہاری گو سالہ پرستی کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کیا، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ یعنی تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ یہاں لَعَلَّ ”کی“ کے معنی میں ہے (تاکہ) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری گو سالہ پرستی کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کیا تاکہ اس معافی کے نتیجے میں رجوع پر ایک انجام تھی، تم شکر کرو، کیونکہ کسی کی غلطی معاف کر دینا بھی دانا، اور عقلمند کے یہاں شکر کا باعث ہے۔

کتاب و فرقان

دَاذِ ابْنِ مَوْسَى الْكِنْتِ وَالْفُرْقَانَ یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور

فرقان ہی تھی ”کتاب“ سے مراد ”تورات“ ہے اور ”فرقان“ سے مراد حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے ”فرقان“ کی یہی تفسیر منقول ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”کتاب“ ہی ”فرقان“ ہے یعنی حق اور باطل کے درمیان امتیاز۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید کے مجموعہ کا نام ”فرقان“ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں یہ بھی روایت ہے کہ ”فرقان“ سے ”يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّلَاقِ الْجَمْعَانِ“ میں اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز کر دیا تھا کہ مسلمان باوجود بے سروسامانی اور قلت تعداد کے لڑائی میں کامیاب ہوئے تھے، اور اللہ تعالیٰ کا وہ فیصلہ مراد ہے جس نے حق و باطل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی ”فرقان“ عطا فرمایا تھا کہ جس سے انھوں نے بنی اسرائیل اور فرعونوں میں امتیاز قائم کر دیا تھا، اور بنی اسرائیل کو بچا لائے تھے۔ ان میں یہ امتیاز و تفریق موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کے بعد پوری طرح واضح ہو گئی۔ یعنی جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین سے اللہ تعالیٰ نے فتح کے ذریعہ ممتاز کیا تھا، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے ممتاز کیا، سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوالعالیہ اور مجاہد رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ اس آیت میں ”فرقان“ سے مراد وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر دیا تھا۔ گویا ”فرقان“ تورات کی صفت ہے، اور آیت میں ”کتاب“ بھی تورات کی صفت ہے، اول دونوں کا ایک دوسرے پر عطف کر دیا گیا ہے ”کتاب“ کے متعلق ہم نے اس سے پہلے ایک موقع پر تفصیل سے لکھا ہے کہ ”مکتوب“ کے معنی میں ہے۔

”لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ“ کی تفسیر ”لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ“ کی طرح ہے، یعنی تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔ گویا مفہوم یہ ہو گا کہ یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم موسیٰ کو تورات دی جس سے حق اور باطل کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے، تاکہ تم راستہ پا جاؤ اور اس حق کی پیروی کرو جو اس کے اندر ہے۔

وَاذْ قَالِ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اودوہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بے شک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا

اِذْ قَالِ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

سو تم اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ پھر بعض آدمی بعض آدمیوں کو قتل کرو۔ یہ عمل درآمد تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ تمہارے خالق کے نزدیک

فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

پھر حق تعالیٰ تمہارے حال پر اپنی عنایت سے متوجہ ہو۔ بیشک وہ توبہ پسند ہے اور توبہ قبول کر لیتے ہیں

توبہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ وقت بھی یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اے میری قوم! یقیناً تم لوگوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے

بنی اسرائیل کا ”اپنے اوپر ظلم“ یہ تھا کہ انہوں نے وہ کام کیا تھا جو انہیں کرنا نہ چاہیے تھا اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے سزا مقرر کی گئی۔ جو شخص بھی ایسا کام کرے جس کے نتیجہ میں اللہ کی طرف سے سزا اس پر لازم ہو جائے تو گویا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کہ اس نے اپنی بد عملی سے اللہ کی سزا اپنے اوپر لازم قرار دے لی۔ وہ کام جسے کر کے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا وہ ان کا ارتداد تھا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد گوسالہ کی پوجا شروع کر دی تھی۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس گناہ کو چھوڑنے اور اللہ کی بارگاہ میں اس سے توبہ کرنے کا حکم دیا اور انہیں بتایا کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اسے تسلیم و رضا کے ساتھ بجالائیں۔ آپ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ توبہ کی صورت یہ ہے کہ تم اپنے ہی اثنیٰ خاص کو قتل کرو۔ ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ ”توبہ“ کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں انہیں چھوڑ کر ان کاموں میں لگ جانا جو اسے پسند ہیں اور جن سے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ توبہ کے سلسلے میں موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کو بنی اسرائیل نے مان لیا اور ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔

ابو عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل ہے کہ انہوں نے گلے پکڑ لئے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ بعض نے بعض کی طرف بڑھ کر ان کے گلے پکڑ لئے اور انہیں قتل کرنا شروع کر دیا، نہ کوئی کسی اپنے قریبی رشتہ دار پر ترس کھاتا تھا اور نہ کسی بھی شخص پر، آخر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے سے اشارہ کیا تو سب نے جو کچھ بھی ان کے ہاتھوں میں تھا پھینک دیا۔ جب بعد میں جائزہ لیا گیا تو مقتولین کی تعداد ستر ہزار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ ”توبہ“ کے لئے اتنا بہت ہے اب قتل کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کپڑے سے اشارہ کیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا کہ انہیں اپنی ہی قتل کرنا ہے تو وہ لوگ جنہوں نے گوسالہ کی پوجا کی تھی الگ کیے گئے اور سب کو بٹھا دیا گیا اور جو لوگ اس گناہ میں ملوث نہیں ہوئے تھے (لیکن گوسالہ پرستوں کو منع بھی نہیں کیا تھا) وہ کھڑے ہو گئے اور اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے پکڑ لئے۔ پھر شدید اندھیرا چھا گیا اور ان میں سے بعض، بعض کو قتل کرنے لگا۔ جب اندھیرا چھٹا تو ستر ہزار مقتول پائے گئے، یہ ان لوگوں کی بھی توبہ تھی جو قتل کر دیئے گئے تھے، اور ان کی بھی جو زندہ رہ گئے تھے۔

سیدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام (کو وہ طور سے) واپس آئے تو فرمایا، اے میری قوم! کیا تم سے

اللہ تعالیٰ نے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے الواح (جن پر تورات لکھی ہوئی تھی) رکھ دیں اور اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کا سر پکڑ کر کھینچنے لگے۔ ہارون علیہ السلام نے عرض کی، میرے بھائی! میرا سر اور دائرہ ہی پکڑ کر مجھے نہ گھسیٹے، مجھے تو اس کا ڈر تھا کہ اگر میں نے بنی اسرائیل کو سختی سے روکا اور اس کے نتیجے میں ان میں اختلاف و نزاع پیدا ہو گیا تو کہیں آپ واپس آکر یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل میں اختلاف پیدا کر دیا اور میرا انتظار نہیں کیا، چنانچہ آپ نے ہارون علیہ السلام کو تو چھوڑ دیا، لیکن سامری کی طرف بڑھے اور فرمایا سامری! یہ تم نے کیا کیا ہے؟ پھر آپ نے اسے پکڑ کر ذبح کر دیا اور ریتی سے پھاڑ کر اس کے ٹکڑے دریا میں ڈال دیئے۔ ان دنوں جتنے بھی دریا بہتے تھے ان سب میں ان کا کچھ نہ کچھ حصہ پڑا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب اس کا پانی پیو۔ سب نے پانی پیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں جو بھی گوسالہ سے محبت رکھتا تھا اس کے موچھوں پر سونا نکل آیا۔

اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”گوسالہ کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی ان کے کفر کی وجہ سے“ جب بنی اسرائیل کو اس کا احساس ہوا کہ واقعی انھوں نے گمراہی اختیار کر لی تو پھر کہنے لگے ”اے ہمارے رب! اگر تو نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہماری مغفرت نہ کی تو یقیناً ہم گھائے میں رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے“ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے سے انکار کیا، اور حکم دیا کہ صرف اس صورت میں ان کی توبہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایسا عمل کریں جو ان پر شاق ہو، یعنی گوسالہ پرستی کرنے والے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں، پس موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اے قوم! تم نے گوسالہ پرستی کر کے اپنے اور ظلم کیا ہے اس لئے اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں توبہ کرو۔ اور اپنے آپ کو قتل کرو۔ بیان کیا کہ پھر بنی اسرائیل دو صفوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر فریق نے اپنی تلواریں کھینچ لیں، گوسالہ پرستی کرنے والوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جنھوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی۔ فریقین میں سے جو بھی قتل ہوا وہ شہید کہلایا، جب بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی اور قریب تھا کہ سب ہلاک ہو جائیں، اس کے ستر ہزار افراد قتل ہو چکے۔ تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! بنی اسرائیل سب ہلاک ہو جائیں گے۔ اے ہمارے رب! جو باقی رہ گئے ہیں انھیں باقی رہنے دیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی، اور انھیں سنبھالا رکھ دینے کا حکم دیا۔ اس میں جتنے افراد قتل ہوئے انھیں شہادت نصیب ہوئی، اور جو زندہ رہ گئے ان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔

اس واقعہ کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اشارہ ہے کہ ”پھر تمھاری توبہ قبول کر لی، یقیناً وہ بڑی توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔“

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ اس معرکہ میں بیٹے نے باپ کو، اور باپ نے بیٹے کو قتل کیا تھا، جب کہیں ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جب بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی اور اندھیرا کچھ چھٹا انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے اللہ کے نبی! ہمارے لئے دعا کیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی سے ان کے لئے براہم دعا کر رہے تھے، آخر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تو سب کے ہاتھ روک دیئے گئے، اب سب نے سنبھالا پھینک دیا۔ اس حادثہ پر موسیٰ علیہ السلام بھی بہت رنجیدہ ہوئے اور بنی اسرائیل بھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی کہ آپ رنجیدہ نہ ہو جو لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں وہ میرے یہاں زندہ ہیں۔ اور (جنت سے) انھیں روزی دی جاتی ہے، اور جو لوگ زندہ رہ گئے ہیں ان کی توبہ میں نے قبول کر لی ہے۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام و تمام بنی اسرائیل خوش ہو گئے۔

اے یہ اسرائیلی روایت بالکل موثوق اور غلط ہے، سامری اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہا تھا۔ البتہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے حق میں بد دعا کی تھی۔ (مترجم)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم اس لئے ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جان لیا تھا کہ گو سالہ پرستی کو باطل سمجھتے ہوئے بنی اسرائیل کے بعض افراد نے گو سالہ پرستوں کو اس سے صرف اس لئے نہیں روکا تھا کہ کہیں آپس میں لڑائی نہ ہو جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ بعض بعض کو قتل کریں۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ جن لوگوں نے گو سالہ کی پوجا نہیں کی تھی انھیں موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو قتل کریں جنھوں نے گو سالہ کی پوجا کی تھی، چنانچہ بجا ریوں کو باہر بٹھا دیا گیا اور دوسرے لوگوں نے انھیں قتل کرنا شروع کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر رونے لگے، عورتیں اور بچے بھی ان کے پاس جمع ہو گئے تاکہ ان کے لئے معافی مانگیں آخر ان کی توبہ قبول ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ تلوار روک لیں۔

ابن زید رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ صرف ستر آدمی ایسے تھے جنھوں نے ہارون علیہ السلام کے ساتھ گو سالہ پرستی نہیں کی تھی۔ آپ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ان پر بادل بھیجے گئے تھے (جس سے ایسا اندھیرا چھایا کہ بہتوں نے اپنے باپ اور بھائی کو قتل کر ڈالا اور اندھیرے کی وجہ سے) انھیں احساس نہ ہوا۔ بیان کیا کہ جو لوگ قتل ہوئے انھیں شہادت کا درجہ ملا اور جو باقی رہ گئے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ ان کا یہی عمل ان کے حق میں گو سالہ پرستی سے توبہ بن گیا، اس لئے **فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ** کا مطلب یہ ہو گا کہ اپنے خالق کی طاعت و بندگی طرف واپس آ جاؤ اور وہی کام کرو جس سے وہ خوش اور راضی ہو۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے **فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ** کے متعلق فرمایا کہ ”بارئ“ کے معنی خالق کے ہیں **بِرَّاءُ اللّٰهُ الخَلْقِ**، **بَارِئٌ** (اصل معنی چیز پیدا کرنا ہے) اسم فاعل ”بارئ“ ہے ”برئ“ مطلق کو کہتے ہیں۔

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ مِّنْ عَذَابِ بَارِئِكُمْ یعنی اپنی توبہ کے تمھارے لئے تو بہتر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے تم آہستہ آہستہ عذاب سے بچ جاؤ گے، بلکہ تمھیں اس پر ثواب ملیگا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ یعنی تمھارے اس عمل کو جس کا اس نے تمھیں حکم دیا تھا کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کرے اس نے قبول کر لیا، **فَتَابَ عَلَيْكُمْ** یعنی جو تم چاہتے تھے کہ تمھارے گناہوں سے تمھیں معافی مل جائے اور جو عظیم جرم تم نے کیا ہے اس سے ڈر کر کیا جائے تو تمھارے رب نے تمھارے ساتھ ایسا ہی کیا **لَهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ** جو شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں، اس کی طاعت و فرمانبرداری کے جذبے کے ساتھ حاضر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

”الرحیم“ یعنی اس پر رحمت کرتا ہے اور اسے اپنے عذاب و عتاب سے نجات دیتا ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتّٰى تَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ فَاخِذْ بِكَ مِنَ الصَّعِقَةِ لَعَلَّ

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ موسیٰ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمھارے کہنے سے یہاں تک کہ تم خود (دیکھ لیں) اللہ تعالیٰ کو اعلانیہ طور پر سو (اس گستاخی پر) آبروی تم پر

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

اور تم (اس کا) آنگھوسے دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تم کو زندہ کر اٹھا یا تمھارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

معاندانہ اور غیر معقول روش | **وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتّٰى تَرٰى اِلٰهَ جَهَنَّمَ** یعنی وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم تمھاری تصدیق ہرگز

نہ کریں گے، اور جو کچھ تم اللہ کی طرف سے لائے ہو، اس کا اقرار ہرگز نہ کریں گے، جب تک ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں، یعنی

ہمارے اور اللہ کے درمیان میں کوئی پردہ نہ رہے اور ہم اپنی انہیں ناسوئی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو خود جب تک نہ دیکھیں پس (صرف آپ کے کہنے سے نہیں مانیں گے) جھٹرا لڑکینہ رکنوں کا پانی دکھائی دینے لگا، اس وقت بولتے ہیں جب پہلے سے پانی پر مٹی پڑی رہی ہو، پھر مٹی کو اس طرح نکالا گیا ہو کہ پانی صاف آ گیا ہو اور اچھی طرح دکھائی دینے لگا ہو۔ جہر، اجہر، جہرا و جہرہ۔ "جہر فلا بہتلاکراستو یوتیہن" جب کوئی شخص کسی چیز کا برسر عام اعلان کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما "بہرہ" کی تفسیر "علائیہ" منقول ہے۔ قتادہ ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "حتی نری اللہ جہرہ" یعنی جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے نہ آئے (ہم ایمان نہ لائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے آباء اور اسلاف کے اختلافات اور انبیاء و پر ایمان میں عدم استقامت کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ اکثر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھا کرتے تھے ان سے ان کے دلوں کا تلحجان دور ہو جانا چاہیے تھا اور تصدیق و ایمان پر استقامت و اطمینان حاصل ہو جانا چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ کے انعامات بھی ان پر بہت ہو کر تھے، لیکن اس کے باوجود وہ کبھی اپنے نبی سے یہ مطالبہ کر بیٹھتے کہ اللہ کے علاوہ ان کے لئے کچھ اور معبود بنا دیئے جائیں، کبھی خود اللہ کو چھوڑ کر گوسالہ کی پوجا کرنے لگتے، کبھی کہتے کہ جب تک ہم خود اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہ لیں آپ کی تصدیق نہیں کریں گے، کبھی اگر انہیں کفار سے جنگ کے لئے بلایا جاتا تو کہتے کہ تم اور تمہارا رب جا کے لڑ لو، ہم تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ اپنے نبی کے ساتھ وہ دوسری بہت سی بے ہودہ اور غیر معقول روشن کامظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں ان کے واقعات کو بیان کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ اب پھر اپنے اسلاف کی روش کو زندہ نہ کریں جو حقور ویر کے لئے دین میں داخل ہو جاتے تھے اور پھر ارتداد اختیار کر لیتے تھے، کبھی موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ تو بہ کر لیتے اور پھر توڑ دیتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ انہیں بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتا رہتا تھا اور ساتھ ہی اپنے بے یاں انعامات سے بھی نوازتا رہتا تھا۔ فَآخَذْنَاكُمْ الصُّعِقَةَ وَالْأَسْوَاقَ تَنْظُرُونَ (اس پر آلیا تم کو صاعقہ نے اور تم اس کا آنا دیکھ رہے تھے) "صاعقہ" کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے فَآخَذْنَاكُمْ الصُّعِقَةَ کی تفسیر صرف اتنی نقل ہوئی ہے کہ "وہ مر گئے" ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک آواز سنی جس سے وہ گر پڑے اور پھر مر گئے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صاعقہ ایک آگ تھی۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہیں زلزلہ نے الیا۔ زلزلہ ہی صاعقہ ہے۔ اس سے وہ سب مر گئے۔

"صاعقہ" ہر اس ہولناک حادثہ کو کہتے ہیں جسے اگر کوئی دیکھ لے یا اس میں مبتلا ہو جائے تو بات موت تک پہنچ جائے یا پھر عقل جاتی رہے، یا جسم کا کوئی عضو معطل اور بے کار ہو جائے خواہ یہ حادثہ آواز کی صورت میں ہو یا آگ یا زلزلہ کی صورت میں نمودار ہو، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ "صاعقہ" سے دوچار ہونے کے بعد آدمی کی موت نہ واقع ہو، موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَخَرَّ مُوسَىٰ صَبْحًا (کوہ طور پر موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر صرف بے ہوشی طاری ہوئی، آپ کی روح قبض نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جب موسیٰ ہوش میں آئے تو کہا کہ میں تیری بارگاہ میں تو بہ کرتا ہوں" لیکن یہاں پر آیت کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

وَإِنَّكُمْ تَنْظُرُونَ یعنی تم اس صاعقہ کو دیکھ رہے تھے جس نے تم کو الیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ صاعقہ نے تمہیں علائیہ الیا تھا اور تم اس کے آنے کو دیکھ رہے تھے۔

وَوَارَهُ زَنْدُكَ | ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكَ لَعَلَّكَ تَشْكُرُونَ (پھر ہم نے تمہیں جلا اٹھا یا تمہارے

مرنے کے بعد، کہ شاید تم شکر گزار بنو" یعنی ہم نے تمہیں جلا اٹھایا۔ "بعث" کا اصل مفہوم کسی چیز کو اس کی جگہ سے اٹھانا اور بھارنا ہے، اسی سے ہوتے ہیں: "بَعَثْتُ فُلَانًا رَا حِلْتَهُ" جب کوئی شخص سواری کو اس کے باندھنے کی جگہ سے سفر کے ارادہ سے اٹھائے۔ "بَعَثْتُ فُلَانًا لِحَاجَتِي" یعنی میں نے فلاں کو اپنی ایک ضرورت کی وجہ سے اس کی جگہ سے اٹھایا۔ قیامت کے دن کو بھی "یوم بعث" اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس دن سب کو حساب کے لئے ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا "من بعد موتکم" یعنی صاعقہ سے تمہاری موت کے بعد "تعلکوا تشکرون" یعنی ہم نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تاکہ تم اس نعمت پر شکر کرو جو ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں زندہ کر کے کیا ہے، ہم نے تمہاری اس گستاخی کی سزا تمہیں صاعقہ کے ذریعہ دیدی تھی۔ لیکن تو بیکے لئے تمہیں پھر زندہ کیا تاکہ اپنے عظیم گناہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں رجوع کرو۔ آیت کی یہ تفسیر اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ "بعثناکم" کا مطلب "ہم نے تمہیں جلا اٹھایا" کیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے "بعثناکم" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ہم نے تمہیں انبیاء پیدا کئے" یہ روایت ساری رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ پھر تمہیں "صاعقہ" نے آلیا، پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد زندہ کیا، دراصل لیکہ تم موت کے بعد اپنے زندہ ہونے کو دیکھ رہے تھے پھر تم میں انبیاء پیدا کئے تاکہ تم شکر گزار بنو۔

لیکن یہ تفسیر آیت کی ظاہری ترتیب کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ تفسیر صحیح نہیں ساری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی بنیاد پر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ شکر گزار بھی کی وجہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء پیدا کئے تھے "لنؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃ" کے سلسلہ میں تفصیلی واقعہ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام (قورات لیکر) واپس اپنی قوم کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ یہاں گوسالہ کی پوجا ہو رہی تھی۔ پھر اپنے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام اور سامری سے جو کچھ کہتا تھا کہا، گوسالہ کو جلا دیا اور اسے دریا میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اپنی قوم کے ستر افراد اپنے ساتھ لئے جو سب سے بہتر اور پوری قوم میں منتخب تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ اللہ عزوجل کے حضور میں چلو اور اپنے اس عمل سے توبہ کرو جو تم نے کیا ہے (یعنی گوسالہ پرستی) اور اپنی قوم کے دوسرے ان افراد کے لئے بھی توبہ کی درخواست کرو جو تمہارے ساتھ نہیں آسکے ہیں، روزہ رکھو، پاکیزگی اختیار کرو اور اپنے کپڑے پاک صاف کر لو۔ چنانچہ آپ ان سب کو ساتھ لیکر طور سینا کی طرف روانہ ہوئے، جہاں آپ کے رب نے آپ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہاں جب بھی آتے تو اللہ کی اجازت سے آتے (ابن اسحاق نے کہا کہ) مجھ سے روایت بیان کرنے والوں نے جیسا کہ بیان کیا ہے، موسیٰ علیہ السلام کی ہدایات کے مطابق جب انہوں نے عمل کر لیا اور اللہ سے ملاقات کے لئے نکلے تو آپ سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ آپ ہمارے رب کو ہمارے پاس ہی بلا دین تاکہ ہم اپنے رب کی گفتگو خود سن سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، ایسا ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ جب آپ پہاڑی کے قریب پہنچے تو بادل چاروں طرف مٹا لانے لگے اور پوری پہاڑی بادلوں میں چھپ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام بالکل قریب پہنچ گئے اور بادلوں کے اندر چلے گئے۔ آپ نے قوم سے بھی فرمایا کہ قریب آ جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب سے گفتگو کرتے تو آپ کی پیشانی پر ایک چمکدار نور نمودار ہو جاتا تھا۔ کسی بھی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی طرف دیکھ سکے، قوم کے افراد قریب پہنچ گئے اور حیرت بدلی کے اندر چلے گئے تو سب میں گہرے۔ اس وقت انہوں نے سنا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کر رہا تھا۔ انہیں کچھ چیزوں کا حکم دے رہا تھا اور کچھ چیزوں سے منع کر رہا تھا کہ فلاں فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے بادل چھٹے تو آپ اپنی قوم کے ان ستر افراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن انہوں نے فوراً ہی یہ مطالبہ رکھ دیا "کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں" اس وقت

انھیں کہہ کر کبھی صاعقہ نے آیا اور وہ تمام وہیں مر گئے۔ اب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے حضور میں روئے گا کہ گڑبگڑا تے اور دعا کرنے لگے کہ اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی انھیں اور مجھے ہلاک کر سکتا تھا۔ انھوں نے واقعی بے وقوفی کی تھی، تو کیا یہ قوفوں کے کرتوت کی پاداش میں میسر ہو چکے جو بنی اسرائیل رہ گئے ہیں انھیں بھی ہلاک کر دے گا؟ مطلب یہ تھا کہ یہ چیز تو تمام بنی اسرائیل کی ریادہ کا باعث بن جائے گی۔ کیونکہ میں ان کے ستر منتخب اور ان میں سب سے بہتر افراد اپنے ساتھ لایا تھا، تاکہ وہ ان کے پاس واپس جا کر (میری تصدیق کریں) لیکن اب ان میں کوئی بھی زندہ نہیں ہے، اب میری تصدیق وہ کس بنیاد پر کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہی دعائیں کرتے رہے اور آخر کار ان کی دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ پھر آپ نے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے توبہ کی درخواست پیش کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوگی جب تک وہ اپنے ہی آڈیوں کو قتل نہ کریں۔

ساری رحمتہ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں جو روایت ہے اس کی ترتیب اس طرح ہے کہ جب بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کے ہاتھوں انھیں کے آدمی قتل ہوئے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تو پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے چند افراد کو ساتھ لیکر میرے پاس آؤ اور وہ لوگ گوسالہ پرستی سے توبہ اور معذرت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ملنے کے لئے جگہ اور وقت متعین کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے ستر افراد منتخب کئے اور توبہ کے لئے روانہ ہوئے۔ جب متعینہ جگہ پہنچے تو بنی اسرائیل کے ان افراد نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک علانیہ اللہ تعالیٰ کو خود نہ دیکھ لیں۔ آپ نے گفتگو تو کر لی، لیکن اب ہمیں دکھائی دیجئے، اس وقت انھیں دکھائی ہی غش آگیا اور وہ سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام روئے لگے اور اللہ سے دعا کرنے لگے کہ اے میرے رب! بنی اسرائیل کو سزا کیا جواب دوں گا، ان میں جو منتخب تھے انھیں بھی توبہ ہلاک کر دیا۔ میرے رب! اگر تو چاہتا تو انھیں اور مجھے اس سے پہلے ہلاک کر سکتا تھا۔ کیا اب سب کو بے وقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کر دے گا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی۔ یہی ستر افراد وہ ہیں جنھوں نے گوسالہ کو معبود بتایا تھا، اسی واقعہ کی طرف اشارہ قرآن مجید کی آیت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ صرف تیری طرف سے آزمائش ہے تو جسے چاہے اس کے ذریعہ گمراہ کرے اور جسے چاہے اس کے ذریعہ ہدایت دے، بلاشبہ ہم نے تیرا استہ پالیا ہے۔ اور اسی واقعہ کی طرف اشارہ قرآن مجید کی آیت میں ہے کہ ”اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ، ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں تو انھیں صاعقہ نے آیا“ آخر اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر دیا اور ایک ایک کے سطح زندہ ہوتے رہے کہ ان میں سے بعض، بعض دوسرے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا کہ کس طرح انھیں زندہ کیا جا رہا ہے۔ پھر بنی اسرائیل کے ان افراد نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جو بھی دعا کرتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے، اس لئے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ اللہ ہماری قوم میں انبیاء پیدا کرنا رہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی اور ان میں انبیاء پیدا ہوئے آیت ”ثم بعدنا کہ من بعد موتکم“ (پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد جلا اٹھایا) میں اسی کی طرف اشارہ ہے، لیکن ساری رحمتہ اللہ علیہ نے واقعہ کی ترتیب الٹ دی ہے۔ واقعہ کے جو اجزاء پہلے تھے انھیں موخر کر دیا اور جو بعد میں انھیں مقدم کر دیا۔ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام ان الواح کو لیکر واپس آئے جن میں تورات لکھی ہوئی تھی تو دیکھا کہ انھوں نے گوسالہ کی پر جا شروع کر رکھی ہے اس لئے آپ نے انہوں ہی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ ان الواح میں اللہ کی کتاب ہے اس میں کچھ چیزوں کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور بعض چیزوں سے روکا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ تنہا آپ کی بات

کون مان لے گا، ہرگز نہیں، خدا کی قسم جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے نہ آجائے اور ہم علانیہ اسے نہ دیکھ لیں۔۔۔۔۔ وہ ہم سے خود کہہ دے کہ یہ میری کتاب ہے تم اس پر عمل کرو۔ آخر وہ خود ہم سے کیوں نہیں کہتا۔ اس پر اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور صافقہ نے انھیں آلیا۔ یہ توبہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ چنانچہ سب مر گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کیا۔ آپ نے اس کے بعد یہ آیت پڑھی ”ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون“ (پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں جلا اٹھایا تاکہ تم شکر گزار بنو) اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پھر کہا کہ اب اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ۔ لیکن انھوں نے اب بھی انکار کیا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، تمہیں کچھ احساس بھی ہے، ابھی تم پر کیا گزری تھی؟ انھوں نے کہا کہ ہم پر موت طاری ہو گئی تھی اور پھر ہمیں زندہ کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا تو اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ، لیکن وہ انکار ہی کرتے رہے اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرشتے بھیجے جنھوں نے ان کے اوپر پہاڑ معلق کر دیا۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مختصر طور پر اور ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے نسبتاً تفصیل کے ساتھ روایتیں اسی کے مطابق ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ ”لنؤمن لک حتی نری اللہ جہراً“ تو بنی اسرائیل کے اس مطالبہ کی وجہ ہم نے جن مختلف روایات میں نقل کی ہے وہ اس درجہ کی نہیں ہیں کہ ان کے متعلق یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکیں کہ واقعی وہ صحیح بھی ہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ جو مطالبات انھوں نے کئے تھے ان کا ایک جز یہ بھی رہا ہو۔ لیکن چونکہ اس سلسلہ میں کوئی قطعی اطلاع ہمارے پاس نہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ تفسیر میں صرف اس پر اکتفا کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کو علانیہ دکھاؤ اور یہاں اس واقعہ کا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے یہودیوں کو تنبیہ کرنی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر واضح اور روشن دلائل کے باوجود تم کفر اور انکار کئے جا رہے ہو، آیت کا مقصد بھی اسی کا ہے، اس کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ بنی اسرائیل کے مطالبہ ”لنؤمن لک حتی نری اللہ جہراً“ کے سبب کی تلاش کی جائے۔ جو روایات اس سلسلہ میں ذکر ہوئی ہیں ہم ان سب کا علی الاعلان انکار نہیں کرتے، ممکن ہے ان میں بعض صحیح ہوں۔

وَضَلَلْنَا عَالِيكَمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّانَ وَالسَّلْوَانَ كُلُّوْا مِنْ طَيِّبَاتِ

اور سایہ افگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میران تیب میں) اور (خیزان غیب سے) اپنیجا یا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بیڑیں، کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ تم نے

مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

تم کو دی ہیں اور اس سے انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

”وَضَلَلْنَا عَالِيكَمُ الْغَمَامَ“ (اور ہم نے تمہارے اوپر بادل کا سایہ کیا) وَضَلَلْنَا عَلَيْكُمْ كَالْعَظْفِ ”ثم بعثناکم من بعد موتکم“ پر ہے۔ مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد جلا اٹھایا اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا۔ اس کے علاوہ ان پر اپنے اور بہت سے انعامات کا ذکر کیا ہے تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ ”غمام“ غماتہ کی جمع ہے جیسے سحاب، سحابہ کی۔ ”غمام“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آسمان کو چھپالے۔ بادل، لڑائی وغیرہ میں اٹھنے والا غبار اور اس کے علاوہ اس طرح کی بہت سی ایسی چیزوں پر اس کا اطلاق صحیح ہے جس سے آسمان، انسان کی نظر سے چھپ جاتا ہو۔ ہر چھپی ہوئی چیز کو اہل عرب ”مغموم“ کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ”غمام“ جس کا بنی اسرائیل پر سایہ کیا گیا تھا وہ کوئی بادل نہیں تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے کہ غمام بادل نہیں، بلکہ وہ ایک ایسی چیز تھی جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جلوہ افروز

ہوں گے۔ ایک روایت میں آپ سے ہے کہ وہ بمنزلہ بادل کے تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ غمام دنیا کے بادل سے زیادہ ٹھنڈی اور خوشگوار چیز ہے، قیامت کے دن اس میں اللہ تعالیٰ آئیں گے اور بدر کی لڑائی کے موقع پر مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے اس میں آئے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہی ”غمام“ بنی اسرائیل کے ساتھ میں ان تیبہ میں تھا۔

”وانزلنا علیک الامن والسوی“ (اور ہم نے تمہارے اوپر امن و سلوی اتارا) مفسرین کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کہ من و سلوی کیا چیز ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”من“ گونا گونا ہے، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”من“ بنی اسرائیل پر ازلے کی طرح گر کر اتا تھا۔ زینج بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ من ایک مشروب تھا، شہد جیسا، اور بنی اسرائیل پر اترا کرتا تھا، بنی اسرائیل اس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ من ترنجبین ہے۔ چنانچہ ساری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ترنجبین کے درختوں پر گر کر اتا تھا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ من ان کے درختوں پر گر کر اتا تھا، بنی اسرائیل جب صبح کو اٹھتے تو انھیں طہا تھا اور جتنا چاہتے اس میں سے کھاتے تھے۔ عامر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ وہ درختوں پر گر کر اتا تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ من شہار تھا جو آسمان سے ان کے لئے گر کر اتا تھا۔ عامر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے کہ من تمہارے اس شہد سے ستر درجہ زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔ بعض حضرات نے تو یہ کہا ہے کہ من ترنجبین کو کہتے ہیں اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ ایک خاص قسم کی گھاس پر گر کر اتا تھا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اتر کے ساتھ یہ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، سانپ کی چھتری بھی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا بخش ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ من، ایک میٹھا مشروب تھا، بنی اسرائیل اسے پکا کر پیتے تھے۔ ”سلوی“ ایک پرندہ ہے جو بیٹیر کی طرح کا ہوتا ہے، واحد و جمع دونوں کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ سلوی جمع ہے، واحد ”سلوۃ“ ہے، ابن مسعود، ابن عباس اور بعض دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ سلوی ایک بیٹیر جیسا پرندہ ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلوی، بیٹیر سے بڑا ہوتا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے صرف اتنی روایت ہے کہ یہ ایک پرندہ تھا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا پرندہ تھا جسے بنی اسرائیل کی طرف جنوب سے ہوا میں لاتی تھیں۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلوی ایک فریہ پرندہ تھا، کبوتر کی طرح۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ ایک پرندہ تھا۔ زینج بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیٹیر جیسا تھا۔ عامر اور ضحاک رحمہم اللہ اور ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بیٹیر ہی کا دوسرا نام سلوی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن حالات میں بنی اسرائیل پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من و سلوی بھیجا اس سے متعلق واقعہ کی تفصیل مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کی توبہ

۱۰ یعنی جزیرہ نمائے سینا میں، جہاں ریگستان اور چٹیل میدان کے سوا اور کچھ نہیں تھا، اور جہاں آفتاب اور دھوپ کی تپش سے انسان کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ جب بنی اسرائیل وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تپش اور گرمی سے محفوظ رکھنے کے لئے ان پر اپنی رحمت سے بادل کا سایہ کیا۔ (مترجم)

۱۱ ترنجبین کے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی لذیذ اور آسمان سے گرنے والی شہد کی قسم کی چیز ہے (مترجم)

قبیل کرلی اور ان ستر افراد کو زندہ کر دیا جو منتخب ہو کر موسیٰ علیہ السلام کی ساتھ گئے تھے اور جن پر اللہ تعالیٰ نے موت طاری کر دی تھی تو انہیں سرزمین "اسرائیل" جو بیت المقدس کا علاقہ ہے، کی طرف روانگی کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام قوم روانہ ہوئی۔ جب اسریحا کے قریب پہنچ گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے بارہ نقیب منتخب کر کے (اسریحا کے حالات معلوم کرنے کیلئے) بھیجے۔ ان نقیبوں، اسریحا کی طاقت و ر اور ظالم قوم اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کر دیا ہے (جس کی تفصیلاً آگے آئے گی) بالآخر موسیٰ علیہ السلام کی قوم (بنی اسرائیل) نے کہہ دیا کہ تم اور تمہارا رب، دونوں جاؤ اور ان سے جنگ کرو ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بہت غصہ آیا اور آپ نے ان کے لئے بددعا کی اور عرض کی کہ اے میرے رب! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی کا مالک نہیں ہوں، پس تو میرے اور فاسق قوم (بنی اسرائیل) کے درمیان جدائی کر دے۔ اس بددعا میں موسیٰ علیہ السلام نے کچھ غلبت کی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سزاؤ مقدس سرزمین کو ان پر چالیس سال تک حرام کر دیا گیا ہے۔ جب اس میدان میں پہنچتے تھے ان کے لئے مقدمہ کر دیا گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو بہت افسوس ہوا، ادھر آپ کی قوم کے وہ افراد بھی آئے جو آپ کے ساتھ تھے اور آپ کی اطاعت کرتے تھے، انہوں نے کہا موسیٰ آپ نے یہ ہمارے لئے کیا کیا ہے؟ جب موسیٰ علیہ السلام کو غم اور افسوس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ "لَا تَأْسُ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ" یعنی جنہیں آپ فاسق کہہ چکے ہیں ان پر غم نہ کھاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان سے اب مطالبہ شروع کیا کہ ہمیں اس چٹیل میدان میں پانی کہاں سے ملے گا؟ کھانا ہم کہاں سے کھائیں گے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے "من" اتارا جو ترنجبین کے درخت پر گر کر اترتا تھا اور سلویٰ اتارا جو بٹیر کی طرح کا ایک پرندہ تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کا کوئی فرد آنا اور ان پرندوں کو دیکھتا کہ اگر فریبہ ہوتے تو انھیں فرج کر لیتا ورنہ چھوڑ دیتا جب پرندہ فریبہ ہو جاتا تو خود ہی وہاں آ جاتا تھا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد کہا کہ کھانا تو مل گیا، لیکن پانی کہاں سے حاصل ہوگا؟ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پتھر پر مارا جس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بنی اسرائیل کے (بارہ قبیلوں میں سے) ہر قبیلے کے لئے ایک چشمہ متعین کر دیا گیا۔ اب بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ کھانا اور پانی ہمیں دونوں مل گئے، لیکن سایہ کہاں ملے گا؟ اسپر اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل سے سایہ کیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ سایہ بھی حاصل ہو گیا، لیکن ہم چمنیں گے کیا؟ اس کے بعد ان کا کپڑا اسی کے مطابق بڑھنا رہنا، جیسے بچے بڑے ہوتے اور پھٹتا بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "و ظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلویٰ" اور ایک دوسرے موقع پر "واذا استسقیٰ موسیٰ لقومه فقلنا اضرب بعصا الحجر فاجحرت مہمہ اثنتا عشرة عینا قد علم کل اناس مشرکیم" میں یہی واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ابن اسحق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی توبہ دگو سالہ پرستی سے قبول کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ انہیں بیت المقدس لے جائیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے وہاں کا قیام ان کے لئے مقدمہ کر دیا ہے اس لئے آپ وہاں جاسیے اور جو ظالم اور آپ کے دشمن اس سرزمین پر قبضہ کئے ہوئے ہیں انھیں وہاں سے نکال باہر کیجئے، میں ان کے خلاف آپ کی مدد کروں گا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم کے مطابق ارض مقدس کی طرف روانہ ہوئے، جب تیرہ (جزیرہ شام، سینا، میں پہنچے جو مصر اور شام کے درمیان میں واقع ہے اور جہاں کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ کہیں ہنسیا تھا، تو موسیٰ علیہ السلام نے سورج کی تپش سے پریشان ہو کر دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے بادل سایہ کے لئے بھیجا، پھر آپ نے بنی اسرائیل کیلئے روزی کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے من و سلویٰ بھیجا۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ چالیس سال کی متعینہ مدت ان پر اس طرح پوری ہوئی کہ من و سلویٰ انپر اترتا تھا اور ان کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوتے تھے، ان کے ساتھ طور پہاڑی کا پتھر تھا، جب کہیں قیام کرتے تو موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا مارتے اور اس سے بارہ چشمے نکل آتے۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اس سلسلے میں ایک مفصل روایت اسی طرح کی ہے ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سدی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح روایت منقول ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر کوئی شخص ایک دن سے زیادہ کے لئے من و سلویٰ لے لیتا تو دوسرے دن وہ سڑ جاتا تھا، البتہ جمعہ کے دن اگر سیر کے لئے وہ پکڑے تو نہیں سڑتا تھا۔ "کلوا من طیبات ما رزقناکم" (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں) یعنی ہم نے ان سے کہا تھا کہ من و سلویٰ کی صورت میں جو روزی ہم نے تمہیں دے رکھی ہے اسے خوب فراخی کے ساتھ کھاؤ۔ اس کا تذکرہ پہلے ہی اس انداز میں ہو رہا تھا کہ کُلْنَا (ہم نے کھا)

کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے نہیں جو روزی دے رکھی ہے اس میں سے اپنی خواہش کے مطابق جی بھر کے کھاؤ بعض مفسرین نے یہ تفسیر کی ہے کہ "من طیبات ما رزقناکم" کا مطلب ہے کہ جو رزق ہم نے تمہارے لئے حلال کی ہے اس میں سے کھاؤ، لیکن بہتر تفسیر پہلی ہی ہے، کیونکہ مذکورہ روزی کی فراخی اور وسعت کا چل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، پھر اس کی صفت "طیب" بیان کی ہے، اس لئے اس کے معنی لطف و آرام اور فراخی و وسعت لینا۔ حلال و مباح سے زیادہ بہتر ہے۔ "ما رزقناکم" کا "ما" الذی کے معنی میں ہے یعنی "جو" پاکیزہ روزی ہم نے تمہیں دی ہے اس میں سے کھاؤ۔ "وما ظلمونا وکن کا نوا" نفسمہم یظلمون" اور انہوں نے زیادتی ہم پر نہیں کی، بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے، یہاں بھی واقعہ کی ایک کڑی چھوڑ دی گئی ہے۔ کیونکہ جس بیچ پر واقعہ بیان ہو رہا ہے اس میں اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ کلام سے خود بخود ظاہر تھی۔ واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ، ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہم نے جو اخص حکم دیا تھا انہوں نے اس کے خلاف کیا، اپنے رب کی نافرمانی کی اور ہمارے رسول کا کہنا نہیں مانا یعنی ہم نے من و سلویٰ کی ذخیرہ اندوزی سے منع کیا تھا، لیکن وہ ذخیرہ کرنے لگے، اور انہوں نے اپنے اس فعل سے ہم پر کوئی زیادتی (ظلم) نہیں کی، بلکہ اپنے ہی اوپر زیادتی کرتے رہے۔ یعنی انہوں نے اپنے اس فعل سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا، نقصان خود اپنا ہی کر لیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی آیت میں "مظلمہ" مفسرت اور نقصان کے معنی میں منقول ہے، ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ "ظلم" کسی چیز کو اس کے حقیقی مقام سے اٹھا کر دوسری غیر مناسب جگہ رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ کسی گنہگار کے گناہ سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کسی ظالم کے ظلم سے اس کے خزانوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی طرح سے کسی اطاعت کرنے والے کی اطاعت فرما کر اور عادل اپنی فرمانبرداری اور عدل سے خود اپنا بھلا کرتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَلَؤَلَيْهَا كَيْفَ تَنْصَلُونَ

اور یاد کرو جب کہ ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس کی چیزوں میں سے جو جس جگہ تمہیں رغبت کرے (یعنی جس سے اور یہ بھی حکم دیا کہ) دروازے میں داخل ہونا عاجزی سے سجداً اور فؤاداً حیطۃ تغفر لکم خطیئکم و سنزید الموحنین فبذل الذین

ظلموا قولا غیر الذی قیل لهم فانزلنا علی الذین ظلموا رجلاً من

السماء بما كانوا یفسقون

بستی میں داخلہ کا حکم

جیسا کہ ہم سے روایتیں بیان کی گئیں، جس بستی (قریۃ) میں نبی اسراہیل کی داخلہ کا حکم ہوا تھا وہ بستی "بیت المقدس" ہے۔ قتادہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ مراد بیت المقدس ہے۔ ریح بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد "اریحا" ہے جو بیت المقدس کے مضافات میں ایک بستی تھی۔ "فکلوا منها حیث شئتم" معانداً یعنی اس بستی

۱۹ صفحہ نمبر ایک صفحہ ۱۹ پر دیکھئے۔

بجہاں سے جی چاہے خوب فراخی اور وسعت کے ساتھ کھاؤ پیو۔ ”رغد“ کا مفہوم اس سے پہلے ہم بیان کر آئے ہیں۔ ”وادخلوا الباب سجدا“ اور دروازہ شہر میں عاجزی سے جھکتے ہوئے جانا اور شہر پناہ کے جس دروازے سے انہیں داخل ہونے کا حکم ہوا تھا اس کے متعلق روایت ہے کہ وہ بیت المقدس کا ”باب الحطہ“ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما درجہ زیادہ مروی رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے۔ ”سجدا“ کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”جھکتے ہوئے“ آپ نے فرمایا کہ انہیں حکم ہوا تھا کہ چھوٹے دروازہ سے جھکتے ہوئے اندر داخل ہوں، ”سجود“ عظیماً جھکتا تعظیم کی غرض سے ہر جھکتے والے کو ”ساجد“ کہہ سکتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ”سجود“ سے یہاں مراد رکوع یعنی جھکنا ہے، اگرچہ سجدہ کے مفہوم میں رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکنا پایا جاتا ہے۔ ”وقولوا حطۃ“ اور کہتے جانا تو یہ ہے ”حطۃ“ فعل کے وزن پر ”حَطَّ اللَّهُ عَنْكَ خَطِيَاكَ“ سے ماخوذ ہے اللہ تمہارا گناہوں کو معاف کر دے (مفسرین کے اس کے مفہوم کے سلسلہ میں کئی اقوال ہیں۔ حسن وقتادہ رحمہما اللہ نے فرمایا ”حطۃ“ یعنی ہماری غلطیوں کو معاف کر دے۔ ابن زید اور ابن جریر سے بھی یہ تفسیر منقول ہے۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ ”قولوا حطۃ“ کا مطلب ہے کہ ”لا الہ الا اللہ کہتے جانا“ اس تفسیر سے یہ مفہوم نکلتا ہے اس کا نام لینے جانا جو تمہارے گناہ معاف کرتا ہے۔ یہ تفسیر عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے استغفار کے معنی میں لیا ہے۔ ایک روایت میں آپ سے یہ مفہوم منقول ہے کہ ”یہی حق ہے“ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دونوں اقوال بھی مفہوم اور مقصد میں عکرمہ رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی طرح ہیں، نحوی اعتبار سے ”حطۃ“ کے رفع کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، عبارتوں ہوں ہوگی۔ ”دخلونا لباب سجدا حطۃ“ اس محذوف پر دلالت آتی وادخلوا الباب سجدا“ کرتی ہے۔ اس لئے اس کو فوراً دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور کلام سے اسے حذف کر دیا گیا۔ میری یہ توجیہ ریح بن انس ابن جریر اور ابن زید رحمہما اللہ کی تفسیر میں نیاید ہے۔ کیونکہ عکرمہ رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی بنیاد پر ”حطۃ“ پر نصب ہوگا۔ کیونکہ ان کی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ ”قولوا لا الہ الا اللہ“ یا ”قولوا نستغفر اللہ“ اس طرح ”حطۃ“ قولوا کا مفعول ہوگا۔ حسن وقتادہ رحمہما اللہ کی تفسیر کی بنا پر بھی ”حطۃ“ کو نصب ہوگا۔ لیکن ان کی تفسیر میں یہ مفعول مطلق ہے، مصدر کو فعل کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ ”نغفركم خطاياکم“ یعنی ہم تمہاری غلطیوں کو اپنی رحمت سے ڈھانک لیں گے تمہاری ستر پوشی کریں گے اور تمہاری ان غلطیوں پر تمہیں سزا دیکر تمہیں رسوا نہیں کریں گے۔ ”غفرا“ کا اصل مفہوم ڈھانک لینا اور ستر پوشی کرنا ہے، جو چیز بھی کسی دوسری چیز کو چھپا لے اسے ”غافر“ کہہ سکتے ہیں، جو ہے کی خود کو بھی اسی لئے ”مغفر“ کہتے ہیں کہ وہ سر کو چھپا لیتی ہے۔ ”غفر“ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو شرمگاہ کو ڈھانک لے۔ ”خطا یا کم“ میں ”خطا یا“ خطیہ کی جمع ہے جیسے مطایا، مطیۃ کی اور حشایا، حشیۃ کی جمع ہے۔ یہ فیصلہ کے وزن پر ”خطی الرجل خطا اور غلطی کرنے کے معنی میں ہے۔ ”وسننید الحسنین“ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر یہ منقول ہے کہ جو تم میں نیک کار ہیں، ہم ان کو زیادہ ہی دیتے ہیں اور جو تم میں خطا کار ہیں ہم ان کی غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔ اس طرح آیت، واذقلنا داخلوا هذا القرية“ کی تفسیر یہ ہوگی کہ جتنی بھی پاکیزہ چیزیں اس بستی میں ہیں وہ سب تمہارے لئے مباح ہیں پوری فراخی کے ساتھ ان کا استعمال کرو، تم پر اس کا کوئی حساب نہیں، اور دروازہ شہر میں عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونا اور کہتے ہوئے جانا کہ ہمارا یہ جھکنا اللہ کے لئے ہے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کر دے اور انہیں چھپا دے، (اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہاری خطاؤں کو اپنی رحمت سے ڈھانک لیں گے، ان کی پردہ پوشی کریں گے اور جو سزا اس کی

یہ فلسطین کا مشہور شہر ہے، موجودہ لغتوں میں صلحہ کے نام سے ملے گا۔ یہ بحر مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع کے زمانہ میں فتح کیا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات وہ تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ اگر قریہ (بستی) سے مراد ”اسیحا“ لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے کا ہوگا۔ قرآن مجید واقعات صرف عبرت و نصیحت کے لئے ذکر کرتا ہے۔ اس لئے اس میں تاریخی ترتیب کی تلاش فضول ہوگی (مترجم)

وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی، ہم اسے ختم کر دیں گے اور جو تم میں نیکو کار ہیں ان پر اپنے سابقہ احسانات کے ساتھ ہم اور تم زیادہ انھیں دیتے ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے انحراف اور ہر طرح کا احسان و انعام کے باوجود انبیاء کا مذاق اور ان کی نافرمانی کا ذکر کیا ہے۔ مقصد ان یہودیوں کو ڈرانا ہے جو ان کی اولاد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے کہ تم بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نہ چلو ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو ان کا ہوا۔

حکم عدولی

مُتَبَدِّلِ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ (مگر ان ظالموں نے جو انھیں بتایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا) "الذین ظلموا" (ان ظالموں نے) سے مراد وہ لوگ بنی اسرائیل ہیں جنہوں نے وہ کام کیا تھا جو انھیں کرنا نہ چاہئے تھا۔ "قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ" کا مفہوم یہ ہے کہ جو انھیں حکم تھا اسے نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف دوسرا کلمہ کہا یہی وہ تغیر اور تبدیلی تھی جس کا انہوں نے ارتکاب کیا تھا۔ ایک کلمہ کہنے کا انھیں حکم ہوا تھا، لیکن اس کے بجائے انہوں نے دوسرا کلمہ کہا ان کی یہ تبدیلی قوی تھی (عملی نہیں) اس سلسلے میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں جھکتے ہوئے جانا اور کہتے جانا، تو یہ ہے، تو ہم تمہاری خطاؤں کو معاف کر دیں گے۔ لیکن انہوں نے اس کے خلاف کیا اور دروازے میں سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور بجائے "حِطَّةُ" (حِطَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ) (ایک بے معنی جملہ) کہا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس دروازے میں انھیں عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونے کا حکم ہوا تھا اس میں وہ سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ "حِطَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں "حِطَّةُ" کی تفسیر کے سلسلے میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انہوں نے "حِطَّةُ" کے بجائے "حِطَّةُ" کہا تھا۔ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے یہ کلمہ کہا تھا "حِطَّةُ حِطَّةٌ" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ شہر کا دروازہ چھوٹا تھا اور انھیں اس میں عاجزی سے جھکتے ہوئے داخل ہونے کا حکم ہوا تھا۔ لیکن وہ سرین کے بل داخل ہوئے اور "حِطَّةُ" کہا یہ تبدیلی انہوں نے استہزاء اور مذاق کے طور پر کی تھی۔ حسن اور مجاہد رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ وہ سرین کے بل اس پہاڑ تک گئے جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلی کی تھی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے (عبرانی زبان میں) الفاظ کہے تھے مہمھی سمقیا یا ازبہنبا، اس کا ترجمہ یہ ہے کہ سرخ رنگ کے گیسوں جن پر سیاہ داغ پڑے ہوں، ریح بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ بعضوں نے اپنے گال کے بل سجدہ کیا، حِطَّةُ کے بجائے حِطَّةُ کہا اور بعض نے "حِطَّةُ فِي شَعِيرَةٍ" کہا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مذاق بنانے کے لئے انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔

عذاب

"فَانزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رَاجِزًا مِّنَ السَّمَاءِ جَمًا كَانُوا يَفْسُقُونَ" (سو ہم نے ان ظلم کرنے والوں پر ایک عذاب آسمان سے نازل کیا، اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہے تھے) "فَانزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا" یعنی ان لوگوں پر جنہوں نے وہ کام کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا کہ انہوں نے اس قول کو بھی بدل دیا جس کا اللہ نے انھیں حکم دیا تھا، اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور جس سے روکا تھا اسے کیا، تو ہم نے ان کے اس فسق کی وجہ سے ان پر آسمان سے "راجز" نازل کیا۔ "راجز" لغت عرب میں عذاب کو کہتے ہیں۔

طاعون کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں رجز کے یہی معنی ہیں، آپ نے فرمایا تھا کہ "إِنَّهُ رَجَزٌ عَذَابٌ بِمِ بَعْضِ الْأَقْوَامِ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ" (وہ ایک رجز ہے جس کے ذریعہ تم سے پہلے کی بعض امتوں کو عذاب دیا گیا تھا) چنانچہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ بیماری (طاعون کی) رجز ہے، تم سے پہلے بعض امتوں کو اس کے ذریعہ عذاب دیا گیا تھا، ایک دوسری روایت میں تعین کے ساتھ بنی اسرائیل کا ذکر بھی ہے کہ یہ عذاب انھیں پر نازل ہوا تھا (یہ خیال مفسرین کا بھی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے رجز کی تفسیر "عذاب" اور ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے "مغضب" نقل ہوئی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل

کی اس نافرمانی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں طاعون پھیلا دیا اور ان کا کوئی فرد بھی زندہ باقی نہ بچا اس کے بعد آپ نے آیت "فانزلنا علی الذین ظلموا الحدیث" پڑھی، آپ نے فرمایا کہ البتہ ان کے بچے باقی رہ گئے اور یہی صاحب فضل و خیر اور عبادت گزار ہوئے جسکی وجہ سے بنی اسرائیل کی تعریف کی جاتی ہے، ان بچوں کے باپ دادا طاعون میں ہلاک ہو گئے تھے، آپ سے بھی رجز "کا معنی عذاب ہی منقول ہی آپ نے فرمایا قرآن میں جہاں بھی "رجز" ہے عذاب ہی کے معنی میں ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ قرآن میں جہاں بھی رجز ہے عذاب ہی کے معنی میں ہے۔ اتنی بات تو بہر حال ثابت ہے کہ رجز، عذاب کے معنی میں ہے۔ اللہ کا عذاب مختلف صورتوں میں نازل ہو سکتا ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے صرف اتنا بتایا ہے کہ ان لوگوں پر جن کا ذکر اوپر ہوا آسمان سے ایک عذاب نازل ہوا تھا، ممکن ہے یہ عذاب طاعون رہا ہو ممکن ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت میں نازل ہوا ہو، قرآن اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جن لوگوں کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ان پر کس طرح کا عذاب نازل ہوا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہم بھی اتنی ہی بات کہیں جو اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے کہ "ان ظلم کرنے والوں پر ان کی نافرمانی کے سبب آسمان سے عذاب نازل ہوا" اگرچہ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے جو تفسیر منقول ہے وہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں بھی طاعون کا ذکر ہے اور آپ نے یہ فرمایا کہ ہم سے پہلے کسی قوم کو اس کے ذریعہ عذاب دیا گیا تھا، لیکن میں اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کوئی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ حضور اکرم کے ارشاد میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کہ یہ عذاب کس قوم پر نازل ہوا تھا، ہو سکتا ہے کسی اور قوم پر یہ عذاب نازل ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی لوگ رہے ہوں جن کا ذکر اوپر آیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم کے خلاف کیا اور جس کلمہ کو انہیں کہنے کا حکم ہوا تھا اسے بدل ڈالا۔ "بما كانوا یفسقون" یعنی اس سبب سے کہ وہ اللہ کی طاعت سے انحراف کرتے تھے، اس کے حکم کے خلاف عمل کرتے تھے اور اس کی معصیت کرتے تھے۔ ہم پہلے لکھا ہے کہ "فسق" کا اصل مفہوم کسی چیز سے نکل جانا ہے،

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَا عَشَرَ نَبِئًا

عرب (حضرت) موسیٰ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کی واسطے اس پر بتنے (موسیٰ کو) حکم دیا کہ اپنی اس عصا کو فلاں پتھر پر مار دو اس سے پانی نکل آئے گا پس (مارنے کی دیر تھی کہ فوراً اس سے

عشرون نبیاً قد علم کل اناس منہم کلوا واشربوا من رزق اللہ

پھوٹ نکلے بارہ چشمے اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے چنانچہ (معلوم کر لیا ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ لکھا اور یہو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور

وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ

عد (اعتدال) مت نکلو فساد و رفتند کرتے ہوئے سر زمین میں

موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ "وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ لِقَوْمِهِ" اصل عبارت یوں ہے "وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ" یعنی وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی۔ یہاں مفعول کی ضمیر "نا"

(ہم سے) کو ذکر نہیں کیا، کیونکہ اس کے ذکر کے بغیر بھی وہ کلام میں سمجھی اور تسلیم کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس کے بعد کی آیت "فقلنا اضرب بعصاك الحجر فانفجرت منه اثنا عشر نبیاً" میں الحجر کے بعد "فضمیہ" ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور وہ اس کے بغیر بھی کلام میں سمجھا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہے "پس ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا پتھر پر مارو اور انہوں نے اس پتھر پر اپنا عصا مارا، تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔" "قد علم کل اناس منہم" میں بھی یہی صورت ہوئی ہے، یہاں "منہم" کا ذکر نہیں ہوا

مفہوم یہ ہے۔ "اور ان کے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ معلوم کر لیا" ہم نے پہلے لکھا تھا کہ "ناس" ایسی جمع ہے جسکے لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں ہے، انسان کی اگر لفظی جمع بنائی جائے تو "اناسین" یا "اناسیتہ" آسکتی ہے (ناس کے وزن پر اس کی کوئی جمع نہیں بن سکتی) قوم موسیٰ سے مراد وہی بنی اسرائیل ہیں جن کے واقعات ان آیات میں بیان ہو رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا اس وقت کی تھی جب وہ میدان "نیہ" میں حیزان و سرگرداں تھی، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اس میدان میں بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پیاس کی شکایت کی۔ چنانچہ انھیں طور سے ایک پتھر اٹھا لانے کا حکم ہوا، تاکہ موسیٰ علیہ السلام اس پر اپنا عصا ماریں۔ وہ اسے اٹھا کر لائے اور جب نیچے اترے تو موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اپنا عصا مارا اس کے نتیجے میں بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین ہو گیا، پانی ان میں سے خوب نکلتا رہتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ یہ واقعہ میدان تیدہ کا ہے، فرمایا ہیں اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کا سایہ کیا تھا، یہیں من و سلویٰ نازل کیا تھا، اسی میدان میں ان کے کپڑے ایسے کر دیئے تھے جو نہ بوسیدہ ہوتے تھے اور نہ میلے ہوتے تھے، یہیں ان کے لئے ایک چوکھے پتھر پر موسیٰ علیہ السلام سے اپنا عصا مارنے کے لئے کہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا اس پر مارا تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر کنارے پر تین تین چشمے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین تھا بنی اسرائیل جب کبھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے تو وہ پتھر بھی ان کے ساتھ رہتا۔ مجاہد اور ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تقریباً اسی طرح کی روایت ہیں۔ سدیی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کے ان بارہ چشموں کی خاص طور سے اطلاع اس لئے دی ہے کہ پہاڑ اور زمین میں سے پانی نکلتے جو متعارف اور عام طریقے ہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے میدان نیہ میں اس سے الگ ایک نئے طریقے سے پانی نکالا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے چشمہ سے واقف تھا اور صرف اپنے ہی چشمہ سے پانی لیتا تھا، اور اس کے باوجود کہ سارے چشمے اسی ایک پتھر سے نکلے تھے، انھیں اپنے اپنے چشموں کو پہچاننے میں کوئی مغالطہ نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ اسی لئے آیت میں اسکا ذکر کیا ہے کہ "ان میں کا ہر شخص اپنے چشمہ سے واقف تھا"۔ "کلوا واشربوا من رزق اللہ" (کھاؤ پیو اللہ کے (دیئے ہوئے) رزق میں سے) اس آیت کا مفہوم بھی سابقہ آیتوں کی طرح ہو گا، یعنی ہم نے کہا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو انہوں نے مارا، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا، پھر ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے۔ اللہ تعالیٰ اطلاع دے رہا ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ انھیں نیہ کے لقمہ و دق ریگستان میں جو من و سلویٰ مل رہا ہے اسے کھائیں اور اس پتھر کے شیریں چشموں سے جو کسی ایک جگہ نہیں ٹھرا رہتا۔ اور جسے صرف ان کے مالک ہی استعمال کر سکتے ہیں، خوب پیئیں۔ اپنے انعامات اور اپنی حلال کی ہوئی روزی کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اب صرف ایک مطالبہ کرتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پھیلانے پھر و اور غرور و سرکشی میں حد سے نہ بڑھو۔ "ولا تغنوا فی الارض مفسدین" یعنی اور زمین میں فساد کی بن کر مت پھرو اور شر و فساد میں حد سے آگے مت بڑھو" ابو العالیہ، ابن زبیر اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم سے یہی تفسیر نقل ہوئی ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ "عنا" (جس سے تغنوا نکلا ہے) کا اصلی مفہوم "فساد پھیلانے میں انتہائی سرگرمی کا مظاہرہ کرنا اور حد سے آگے بڑھ جانا" ہے۔ بولتے ہیں "عاق فلان فی الامن" یعنی فلان شخص فساد پھیلانے میں اپنی حد سے آگے بڑھ گیا۔ کلام عرب میں "عنا" اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۳۳۹۶

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نَصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا

اور جب تم لوگوں نے (موسیٰ) کہا کہ اے موسیٰ! روز کے روز ہم ایک ہی قسم کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من و سلویٰ پر) اور ہمیں اس کا واسطہ ہے، اور درگاہ سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے

مَّا تَنْتَبِئُ الْأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّاءِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلِهَا قَالَ أَسْتَجِيبُ لَكُمْ

ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں لگا کرتی ہیں ساگ (ہوا) لکڑی (دہوئی) گھبوں (ادا) مسور (ہوئی) پیاز (دہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو

الذی ہوا ذی بالذی ہو خیر اھبطوا مصرًا فان لکم ما سألتم و

ادنی درجے کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے۔ کسی شہر میں لہا کر اتر دو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست

ضربت علیہم الذلۃ و المسکنۃ و بآء و بغضب من اللہ ذلک یا تم کا نوا ایکن و

کرتے ہو اور تم گئی ان پر ذلت اور پستی رکھ دو اور ان کی ٹھکانے اور خود ان میں و لو العزیز نہ رہی اور تم کو کئے غضب الہی کے (اور) یہ سوجھ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے

یا ایبت اللہ و یقتلون البینین بغیر الحق ذلک بسا عصوا و کاؤ ایعتد و ن

تھے انکا الہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو کہ وہ قتل خود انکے نزدیک بھی انا حق رہتا تھا اور (نیز) یہ کہتے تھے (ہوا) کہ ان لوگوں اطاعت نہ کی در دائرہ اطاعت سے نکل چکے تھے۔

اس سے پہلے ہم صبر کا مفہوم بتا چکے ہیں کہ نفس کو اس کی مرغوب چیزوں سے روکے رکھنے کا نام ہے۔ اس لئے

تیا مطالب

”واذ قلتم یا موسیٰ سے ویصلہا“ تک آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”اور اسے مضرب بنی اسرائیل! وہ وقت یاد کرو

جب تم نے کہا تھا کہ ہم ہرگز ایک کھانے پر اپنے نفس کو نہیں روک سکتے“ وہ ایک کھانا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

بنی اسرائیل کو مید ان تیرہ میں بھیجا گیا جاتا تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق ”سلوی“ ہے، لیکن وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

وہ کھانا ”گوشت کے ساتھ ملی ہوئی خشک روٹی“ تھی۔ پس اپنے رب سے ہمارے لئے وہ چیزیں مانگئے جنہیں زمین اگاتی ہے، یعنی ساگ

لکڑی“ اور دوسری بہت سی ہنریاں جن کا آیت میں ذکر ہوا ہے۔ ان کے اس مطالبہ کی وجہ قنادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کی ہے کہ

بنی اسرائیل ریگستان میں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کا سایہ کیا تھا اور ان پر من و سلوی نازل کیا تھا، بنی اسرائیل اس سے اکتا

گئے اور اس زندگی کو یاد کرنے لگے جو انھیں مصر میں حاصل تھی۔ پھر اپنی یہ خواہش انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بیان کی تو اللہ تعالیٰ

نے ان سے فرمایا کہ ”کسی شہر میں اتر پڑو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہیں مل جائے گا“ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت

ہے، آپ نے فرمایا کہ کھانے کے لئے انھیں وہاں ”سلوی“ ملتا تھا اور پینے کے لئے ”من“ قنادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت

میں ہے کہ جب بنی اسرائیل شام پہنچے تو انھیں وہ غذا نہیں ملیں جن کے وہ پہلے سے عادی تھے۔ اس لئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام

سے مطالبہ کیا کہ ”ہمارے لئے اپنے رب سے وہ چیزیں مانگئے جنہیں زمین اگاتی ہے، ساگ، ہوا، لکڑی، ہونی، گہو، ہوا، مسور

ہونی، پیاز ہوا“ اس سے پہلے ان پر بادل کا سایہ رہتا تھا اور من و سلوی ان کے لئے اترتا تھا، وہ اس سے اکتا گئے تھے اور مصر کی زندگی انھیں

یاد آنے لگی تھی۔ ایسی ہی اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ بنی اسرائیل نے من و سلوی کے بجائے سبزی وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا۔ میدی رحمۃ اللہ علیہ

نے فرمایا کہ مید ان تیرہ میں انھیں جو کچھ ملتا تھا اس سے وہ اکتا گئے تھے اور مطالبہ کیا تھا کہ ”اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر بس نہیں

کر سکتے“ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مید ان تیرہ میں بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے بھی ایک چیز ملتی تھی اور پینے کے لئے بھی ایک ہی

چیز ملتی تھی، پینے کے لئے انھیں شہد ملتا تھا جو آسمان سے اترتا تھا اور اسے ”من“ کہتے تھے اور کھانے کے لئے انھیں ایک پرندہ ملتا تھا

جسے ”سلوی“ کہتے تھے۔ پرندے کا گوشت کھاتے تھے اور شہد پینے کے لئے استعمال کرتے تھے، اس کے سوا روٹی وغیرہ وہاں وہ

جاتے ہی نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے بجائے سبزی وغیرہ کا مطالبہ کیا۔ پھر آپ نے ”واذ قلتم“ سے ”اھبطوا مصرًا“ تک آیت کی تلاوت

کی۔ ”فوم“ کے معنی کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں، بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے مراد گیہوں اور روٹی ہے۔ عطار، مجاہد،

لہ زراعت پیشہ قوموں کی طرح مصریوں کی مرغوب غذا زمینی پیداوار، سبزی ترکاریاں اور پھل وغیرہ تھے اور یہی چیزیں مصر میں اسرائیلیوں کی بھی

غذا بن چکی تھیں۔ جزیرہ نمائے سینا میں ایک ایسی غذا ہے وہ اکتا گئے تھے جو سبزی اور نلہ کی اقسام سے بھی نہیں تھی اور جس میں کسی قسم

کا تنوع بھی نہیں ہوتا تھا۔ (مترجم)

قتادہ، حسن، ابو مالک، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ بنی ہاشم کی زبان میں فہم، گہیوں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا معنی "ہسن" بتایا ہے، خود مجاہد رحمۃ اللہ سے ایک روایت میں یہ معنی نقل ہوا ہے۔ ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا کہ "فوم" کے معنی میں "ہسن" اور بعض قرأتوں میں تو بصحاحت لفظ "و ثوما" (اور اس کا ہسن) آیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ گہیوں اور روٹی دونوں کے لئے "فوم" اہل عرب کی قدیم لغت ہے چنانچہ بولتے تھے "فومنا لنا" یعنی ہمارے لئے روٹی پکا دو، کہا جاتا ہے کہ "و ثوما" عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر اسے حروف مبدلہ میں سے مانا جائے گا، اور ایسا کلام عرب میں ہوتا ہے کہ مخرج کے قرب کی وجہ سے بعض اوقات حرف کو بدل دیتے ہیں۔ "قال استئین لون الذی هو ادنی بالذی لھو خیر" یعنی اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا تو کیا تم ادنیٰ اور کم قدر و قیمت کی معاش کو بہتر کے مقابلہ میں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ "استبدال" جس سے تشبیہ لیا گیا ہے اس کا یہی مفہوم ہے۔ استبدال کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ایک چیز چھوڑ دی جائے اور چھوڑی ہوئی چیز کی جگہ کوئی دوسری چیز لائی جائے۔ "ادنیٰ" کا مطلب ہے معمولی، حقیر، کم تر، بولتے ہیں "ھذا ارجل ذلی" یا "رائد کبدی فی ارضہ مدیر بغیرہم" یعنی یہ شخص ہمیشہ ذلیل اور حقیر چیلدوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ من و سلویٰ کے مقابلہ میں ساگ، گکڑی، مسور، پیاز اور لہسن کا مطالبہ ایک عمدہ معاش کے مقابلہ میں معمولی اور گھٹیا چیز کی معاش کا مطالبہ ہے۔ آیت کی تفسیر کے سلسلے میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ، کیا تم خیر اور بھلائی کے مقابلہ میں شر اور اس سے گھٹیا چیز کو اختیار کرنا چاہتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "الذی هو ادنیٰ" یعنی کم تر اور حقیر۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ "ادنیٰ" و ثوما سے اسم تفضیل ہے جس کے معنی قریب ہونے کے آتے ہیں۔ "الھبطہ امصی آفان لکم ما سألتم" (کسی شہر میں اتر پڑو وہیں مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو) آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ پھر ان کے مطالبہ پر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور ہم نے ان کی دعا قبول کی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ کسی شہر میں تم لوگ اتر پڑو۔ اس سے پہلے ہم لکھ آئے ہیں کہ "ھبوط" کا مفہوم اترنا اور کس جگہ دار دہونا ہے۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ وقت یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ سو اپنے پروردگار سے آپ ہمارے لئے دعا کر دیجئے ان چیزوں کی جنہیں زمین اُکاتی ہے، یعنی ساگ، گکڑی، گہیوں، مسور، پیاز اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، کیا تم حقیر اور معمولی زندگی کو بہتر اور اعلیٰ زندگی کے مقابلہ میں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ آخر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے دعا کی کہ اے اللہ! جو یہ چاہتے ہیں انھیں عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی اور ان کا مطلوب انھیں عطا فرمایا، اور فرمایا کہ کسی شہر میں اتر جاؤ، جو کچھ تم مانگتے ہو وہیں مل جائے گا۔ "مصعوا" کی قرأت مشہور فارسی زبان میں ہے، تنوین کے ساتھ کی ہے، لیکن بعض حضرات اس پر تنوین نہیں پڑھتے، جن حضرات نے تنوین کے ساتھ (منصرف) پڑھا ہے، ان کے نزدیک "مصر" سے مراد شہر ہے، خواہ وہ کبھی بھی ہو، اس مشہور و معروف قرأت کی بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ (جزیرہ نما کے سینا کے آس پاس) کسی شہر میں اتر جاؤ، اس لئے کہ اس وقت تمہاری زندگی خانہ بدوشوں کی سی ہے اور تم شہری آبادی سے دور ہو۔ جن چیزوں کے تم خواہشمند ہو وہ ریگستانوں اور میدانوں میں نہیں ملے گی، بلکہ ان کے لئے تمہیں کسی شہر میں اترنا پڑے گا۔ اس قرأت کی صورت میں اس سے مراد خاص ملک مصر بھی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جن حضرات نے "مصر" پر تنوین نہیں پڑھی (غیر منصرف سمجھتے ہوئے) ان کے نزدیک تنوین طور پر مراد جانا پہچانا ملک "مصر" ہے جسے چھوڑ کے اب بنی اسرائیل اپنے آبائی وطن جا رہے تھے۔ قرأت کے اسی اختلاف کی بنیاد پر مفسرین کا بھی اس لفظ کی تفسیر کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "کسی شہر میں اتر جاؤ، وہیں مل جائے گا وہ جو تم مانگتے ہو"۔ حدیثی حدیث اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب وہ میدان تیرے سے نکل گئے تو "من و سلویٰ" کا آنا بھی بند ہو گیا اور اب وہ ترکاریاں کھانے لگے۔ مجاہد اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ آیت میں "مصر" سے مراد غیر متعین شہر ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اشارہ بیت المقدس کی طرف تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ان کے قیام کے لئے مقرر کر دیا تھا، آپ نے دلیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا "داخل ہوا و سرزمین

مقدس (شام بیت المقدس) میں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے۔ لیکن ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے روایت ہے کہ مراد فرعون کا ملک "مصر" ہے (جس سے وہ نکل کر آئے تھے) جن مفسرین نے غیر متعین شہر اس سے مراد لیا ہے، اُن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد ملک شام کو ان کے قیام کے لئے متعین کر دیا تھا، لیکن راستے میں جب موسیٰ علیہ السلام نے اُسے کہا کہ "دو اے قوم! سرزمین مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے اور پشت نہ پھیرو کہ اگر تم نے پشت پھیری تو تم بہت نقصان میں رہو گے، تو ان کی قوم کے لوگوں نے کہا، اے موسیٰ! اس میں تو ظالم و جابر لوگ رہتے ہیں، اور جنگ وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے، پس آپ اور آپ کے رب جائیں اور اُن سے جنگ کریں، ہم تو ہمیں بیٹھے ہوئے ہیں" اس طرح جب بنی اسرائیل نے ظالموں سے لڑنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں میدان تیبہ میں مبتلا کر دیا اور جن افراد نے یہ الفاظ کہے تھے ان کے سرزمین مقدس میں داخلہ کی تمام صورتیں ختم کر دیں، پھر جب یہ تمام اسی ریگستان میں مر گئے تو چالیس سال کے بعد ان کی اولاد کیلئے شام میں داخل ہونے کی صورت پیدا کی، ان لوگوں نے یہی بیت المقدس میں سکونت اختیار کی اور شام کا ظالم حکمران، یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں انھیں کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ بیت المقدس میں داخلہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد عمل میں آیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے متعلق تمہیں یہی اطلاع دی ہے کہ بیت المقدس کو اُن کے قیام کے لئے اُس نے مقدر کر دیا تھا، یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد پھر دوبارہ وہاں واپس بھیجا تھا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ "مصر" بغیر تنوین کے غیر منصرف پڑھا جائے اور اس سے خاص ملک مصر مراد لیا جائے۔ لیکن جو مفسرین اس سے خاص ملک مصر مراد لیتے ہیں وہ دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں "فَاخْرِجْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَّعَيْبُونَ وَكُنُوزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيمٍ كَذَلِكَ وَاذْكُرْنَا هَٰئِنَّا اسْرَائِيلَ اذْخَرْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَّعَيْبُونَ وَكُنُوزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيمٍ وَنِعْمَةً كَا نُوْنًا فَاكْفَرْنَا كَذَلِكَ وَاذْكُرْنَا هَٰئِنَّا اسْرَائِيلَ اذْخَرْنَاهُمْ مِّنْ جَنَّتٍ وَّعَيْبُونَ وَكُنُوزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيمٍ" وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جن میں رہا کرتے تھے، چھوڑ

گئے (یہ قصہ) اسی طرح واقع ہوا اور ہم نے ان چیزوں کا مالک ایک دوسری قوم کو بنا دیا) انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں بتایا کہ اس نے ملک مصر کو ان کے لئے مقدر کر دیا تھا اور انھیں ورنہ میں دیا تھا، اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے پاکر پھر اس کی نعمتوں سے وہ منتفع نہیں ہوئے ہوں گے اور اس سے منتفع ہونے اور فائدہ اٹھانے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ مصر دوبارہ واپس گئے ہوں، اگر وہ مصر نہیں گئے ہوں گے تو اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ملک مصر ان کی ملکیت میں اللہ تعالیٰ نے دیدیا تھا اور انھیں اس کا وارث بنا دیا تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پھر دوبارہ وہاں واپس بھی گئے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ابی بن کعب اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قسرات میں بھی "مصر" بغیر تنوین کے (غیر منصرف) پڑھا گیا ہے جس سے بھی متعین اور واضح طور پر سمجھا جاسکتا کہ مراد ملک مصر ہی ہے، ہماری رائے میں نہ تو کتاب اللہ سے یہ ثابت ہوتا کہ ان دونوں تفسیروں سے کوئی تفسیر صحیح اور درست ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس کی تعین کے لئے کوئی قطعی حکم ہے۔ لیکن بہر حال مفسرین کا اختلاف ہے اور ہمارے نزدیک زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی قوم زمیں سے اُگنے والی جن سبزیوں کا مطالبہ کر رہی ہے وہ اسے دی جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اس وقت وہ لوگ جزیرہ نما سینا میں خانہ بدوشوں کی طرح پھرتے رہتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا ہی دعا قبول کی اور انھیں حکم دیا کہ اپنی قوم کے افراد کے ساتھ مستقل سکونت کے لئے کسی ایسے شہر میں اتر جائیں جہاں وہ ترمینی پیداوار ہوتی ہوں جن کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا وہ شہروں اور آبادیوں میں ہی مل سکتی تھیں، اور پھر جب وہ شہری آبادی

میں گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی مطلوبہ چیزیں دیں۔ ممکن ہے کہ وہ شہرِ دجہاں وہ اترے تھے، مشہور ملک مصر رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ شام ہو، البتہ قرأتِ میرے نزدیک ”مصر“ تنوین کے ساتھ (غیر منصرف) ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قرأتِ میرے نزدیک جائز نہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے تمام مصاحف اسی کے مطابق ہیں اور تمام قاریوں کا بھی اس پر اتفاق ہے جن لوگوں نے تنوین کے بغیر ”مصر“ (غیر منصرف) پڑھا ہے، وہ اس حیثیت کے قاری نہیں ہیں کہ اسے مشہور و معروف قرأت کے خلاف دلیل بنایا جاسکے۔ (جن صحابہ سے اس کے حق میں روایت منقول ہے وہ روایت ضعیف ہے)

ذلت و محتاجی کا عذاب

”وَضَعُوبَتِ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ“ یعنی ذلت و محتاجی ان کے لئے لازم کر دی گئی، ان پر جمادی گئی۔ بولتے ہیں۔ ”ضَوْبٌ إِلَّا مَاءٌ الْجَزِيَّةُ عَلَى أَهْلِ الذَّمِّ“ یعنی امام نے غیر مسلم رعایا کے لئے جزیہ متعین کر دیا اور ان پر لازم کر دیا ”ضَوْبٌ الرَّجُلِ عَلَى عَهْدِ الْخِوَارِجِ“ مالک نے اپنے غلام کا خراج طے کر دیا اس پر لازم کر دیا ”ذِلَّةٌ“ فَعَلَةٌ کے وزن پر ”ذَلَّ فُلَانٌ“، يَذَلُّ، ذَلًّا وَذِلَّةً، سے نکلا ہے، جیسے ”صَغُرَ“ ”صَغُرَ“ اور ”فَعَلَةٌ“ ”فَعَلَةٌ“ سے نکلا ہے ”ذِلَّةٌ“ سے مراد وہ ذلت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں پر لازم کیا ہے کہ اپنی حدودِ سلطنت میں کفار کو اس وقت تک ان کے جان و مال کے حفاظت کی کوئی گارنٹی نہ دیں جب تک وہ ایک متعین مقدار میں حکومت کو ٹیکس دینا نہ منظور کر لیں اور جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کا کفر کرنے نہیں رہیں ان سے وہ ٹیکس لیا جاتا رہے جتنا نیک اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ“ (اہل کتاب میں سے جن سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ چھ دین کو قبول کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ جزیہ دین رعیت ہو کر اور اپنی پستی کا احساس کر کے)

حسن اور تقادہ رحمتہ اللہ علیہا سے آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دیا کریں گے، ”الْمَسْكَنَةُ“ تسکین سے مصدر بھی ہے۔ بولتے ہیں ”اسْكُنْ مِنْ فُلَانٍ“ فلاں سے بھی زیادہ مسکین۔ مسکین طبع شخص کے لئے بولتے ہیں ”لَقَدْ تَمَسَّكُنْ مَسْكَنَةً“ بعض اہل عرب ”تَمَسَّكُنْ مَسْكَنًا“ بھی بولتے ہیں۔ یہاں ”مسکنتہ“ سے مراد فاقہ اور محتاجی کی مسکنت ہے، یعنی احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے ذلت۔ ابوالعالیہ اور سردی رحمتہ اللہ علیہا سے مسکنتہ کی تفسیر فقر و فاقہ ہی نقل ہوئی ہے ابن وہب رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ابن زید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ابن وہب رحمتہ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں نے پوچھا کیا مراد مصر کے قبیلوں کے زمانہ کے یہودی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، خدا گواہ ہے، خاص وہ مراد نہیں ہیں، مراد عام یہودی ہیں، بنی اسرائیل! ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کی عزت کو ذلت سے نعمتوں کو خسران سے بدل دے گا اور ان سے اگر ریاضی اور خوش تھا تو اب ان پر غصہ اور غضبناک ہے یہ بدلہ ہے، اس کا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا کفر کیا، بلاحتی کے اللہ کے انبیاء اور رسولوں کو قتل کیا اور ان کی افرامی اور مخالفت کرتے رہے۔ ”ذَبَاؤُا لِبُغْضٍ مِنَ اللَّهِ“ (اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے) ”بَاءٌ ذُو“ یعنی بولتے، واپس ہوئے ”بَاءٌ“ جب بھی استعمال ہوتا ہے تو خیر یا شر میں سے کوئی نہ کوئی چیز اس کے ساتھ ضرور استعمال ہوتی ہے اس سے بولتے ہیں ”بَاءٌ ذُو“ ”بَاءٌ ذُو“ (فلاں اپنے گناہ کے ساتھ اور اسے اپنے سر لئے ہوئے لوٹا) اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”الْحٰقُّ اٰرِيْدَانِ تَبَوَّءُوْا بَاثِمًا وَاثِمًا“ (میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے قتل کا گناہ اور اپنا پچھلا گناہ دونوں اپنے سر رکھے) میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے، یعنی میرے اور اپنے دونوں کے گناہ کا یا راٹھائے ہوئے واپس ہو لہذا ”بَاءٌ وَا لِبُغْضٍ مِنَ اللَّهِ“ کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”جب وہ واپس ہوئے تو اللہ کے غضب کو اٹھائے ہوئے تھے، انہیں اللہ کا غضب پڑ چکا تھا“ ربیع رحمتہ اللہ علیہ نے بھی آیت کا مطلب یہی بیان کیا ہے کہ پس ان پر اللہ کا غضب پڑ گیا، ہٹاک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے“ بندے پر اللہ کے غضب کا مفہوم ہم پہلے

بیان کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ "ذالک یا نثم کا نوا یکفرون بآیات اللہ و یقتلون البینین بغیر الحق" یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرتے رہتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے "ذالک" سے ارشادہ ذلت و سکت کے انپر جمانے اور ان کے اللہ کے غضب کے مستحق ہونے کی طرف ہے۔ "یا نثم کا نوا یکفرون" کا مفہوم یہ ہے کہ "اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے" اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے انپر اپنا غضب اور ذلت و محتاجی اس لئے نازل کی ہے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو کفر کرتے رہتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کر ڈالتے تھے، یعنی ہمارا تعذاب، یہ غضب اور ان کی ذلت و محتاجی، سب کچھ ان کا کفر اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے کا بدلہ تھا۔ "و یقتلون البینین بغیر الحق" یعنی اللہ کے ان پیغمبروں کو وہ ناحق قتل کر ڈالتے تھے جنہیں اللہ اپنی طرف سے احکام اور پیغامات دے کر بھیجتا تھا۔ "انبیاء" جمع ہے اس کا واحد "نبی" ہے۔ اس کے اصل میں ہمزہ بھی ہے، "أَنْبَاءٌ عَنِ اللَّهِ" (اللہ کی طرف سے خبروں) سے نکلا ہے۔ ویسے اس کا اسم "مُنْبَغٍ" ہے "مُنْبَغٍ" کے وزن پر، لیکن اسے فعیل کے وزن پر "بنی" بنا لیا گیا ہے جیسے سمیع سمیع سے اور بصیر مبصر سے بنا لیا گیا ہے، اس طرح کلام عرب میں اکثر ہوتا ہے۔ "بنی" میں ہمزہ کے بجائے یار کھدی گئی ہے اور اس کی جمع "انبیاء" لاتے ہیں۔ بعض اہل عرب سے اس کی جمع "نبأء" بھی سنی گئی ہے، یہ لوگ نئی کو ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس لئے نبیاء جمع لاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں عباس بن مردوس کا ایک شعر ہے۔

يَا خَاتِمَ النَّبِيَّاءِ إِنَّكَ مُرْسَلٌ
بِالْحَقِّ خَيْرٌ هُدًى إِلَّا لِهَذَا كَا

اسے انبیاء کے خاتم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ حق کے ساتھ بھیجے گئے ہیں آپ کی ہدایت اللہ کی طرف سے سب سے اچھی ہدایت ہے یہاں بھی اس وزن پر جمع اسی بنیاد پر ہے کہ اس کا واحد شاعر کے نزدیک ہمزہ کے ساتھ بنتی ہے۔ بعض حضرات نے اسے "بنی" اور نبوت سے ماخوذ مانا ہے، ہمزہ کے بغیر، نجومہ یعنی بلند جگہ کی طرح نبی کا اصل مفہوم یہ حضرات "راستہ" بتاتے ہیں۔ قطامی کا ایک شعر ہے۔

لَمَّا وَرَدَتْ بَنِيًا وَأَسْتَيْتَ لَنَا
مَشْتَقٌّ لِحَطْوِطِ الشَّمْرِ مَشْتَجِلٍ

جب میں راستہ پر اتر اور وہ راستہ ہمارے لئے کھل گیا تو اس کے تمام نشیب و فراز میری نظر میں حقیر ہو گئے اور میں انھیں

خاطر میں نہ لایا

اس شعر میں بھی "بنیا" کا معنی راستہ لیا گیا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے بنی کو بنی اس لئے کہیں گے کہ وہ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں اور ہمارے سامنے اسے صاف اور واضح کر دیتے ہیں۔ "و یقتلون البینین بغیر الحق" کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی طرف سے انھیں کوئی اجازت نہیں اور اس کے بغیر وہ انبیاء کو محض اس لئے قتل کرتے ہیں کہ وہ ان کے منکر ہیں اور ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ "ذالک یا عصوا و کوا یعدون" (یہ سب اس لئے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے) آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ "ان پر ذلت و محتاجی جمادی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے، کیونکہ وہ اللہ کا کفر کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے اور ان کے اس عمل کی وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔" اعتداد کہتے ہیں حد سے بڑھ جانے کو، کہ جو حد اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے مقرر کر دی ہے اس سے وہ تجاوز کر جائیں ہر حد سے بڑھ جانے والے شخص کے لئے "تعدی" کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے جو انہیں سزا دی اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی اور جو حد ہم نے ان کے لئے متعین کر دی تھی اس سے بڑھ کر وہ کام کئے جن سے ہم نے انھیں روکا تھا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصری والصائبین من امن

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صائبین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ

بِاللہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَمْ یَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہُمْ مِنْ دُونِ مَا کَانُوا عَلَیْہِ فِی حَیٰۃِہِمْ سَآئِرًا

تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لئے ان کا حق اشدت بھی ہو ان کے پروردگار کے پاس اور وہاں جا کر کسی طرح کا اندیشہ بھی

عَلِیْہُمْ وَاَہْمُکِزْ لَوْ ت

نہیں ان پر اور نہ وہ منوم ہوں گے۔

”ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصاری والصائبین“ (بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی) ان الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان امور میں تصدیق کی جنہیں لیکن آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ”الذین ہادوا“ سے مراد یہودی ہیں۔ ”ہادوا“ کا مفہوم ہے کہ ”جنہوں نے توبہ کی“ ”ہَاہُوَ الْقَوْمُ ہُوَآ وَہَادَآءٌ“ سے نکلا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہود ان کا نام اس لئے پڑا کہ انہوں نے ایک موقع پر کہا تھا۔ ”اِنَّا ہَدٰنَا الْبَیْطَ“ (ہم تیرے ہی آگے جھک گئے ہیں) ابن جریر رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے کہ یہود نے ایک موقع پر کہا تھا ”انا ہدین الیہ“ اس لئے ان کا نام یہود پڑا۔ ”والنصاری“ نصاریٰ ہیں اس کا واحد نصیران ہے جسے سکاری کا واحد سکران نشاوری کا واحد نشوران ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو صفت بھی واحد میں ”فَعْلَانٌ“ کے وزن پر آتی ہے تو اس کی جمع فعالی کے وزن پر آتی ہے۔ لیکن عام طور سے کلام عرب میں نصاریٰ کے واحد کے لئے نصرانی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا واحد ”نصران“ بھی عربیوں کے بہت سے اشعار میں استعمال ہوا ہے نصاریٰ نام کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے ”ناصیۃ“ نامی بستی میں قیام کیا تھا۔ یہ روایت بھی ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد ”مَنْ اَنْصَارَیْ“ اعلیٰ اللہ، کیونکہ میرا دگوار ہونا ہے اللہ کے واسطے؟) کی وجہ سے ان کے متبعین کا نام نصاریٰ پڑا ہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے کہ ”ناصیۃ“ بستی میں عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے اور اس لئے آپ کے متبعین کا نام نصاریٰ پڑا۔ آپ کے صحابہ کو ”ناصییین“ کہتے تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ”ناصیعی“ کہا جاتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت ہے۔ قاعدہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والے ”ناصیۃ“ نامی ایک بستی میں رہتے تھے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام بھی وہیں تشریف لائے۔ نصاریٰ نے اپنا یہ نام خود رکھ لیا۔ انہیں اس کا حکم نہیں ہوا تھا۔

”الصائبین“ ”الصائبون“ صابی کی جمع ہے، اپنے دین کو چھوڑ کر کوئی نیا دین اختیار کر لینے والے کو کہتے ہیں، اسلام چھوڑ کر اگر کوئی مرتد ہو جائے تو اسے بھی صابی کہتے ہیں۔ اہل عرب ہر اس شخص کو صابی کہتے تھے جو اپنا پرانا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لیتا تھا۔ ”صَبَا فُلَانٌ“ (فلاں بے دین ہو گیا) اسی سے کہتے ہیں صبار اس کا مصدر ہے۔ صَبَاتِ الْجَوْمُ یعنی ستارے نکل آئے۔ ”صَبَا عَلَیْنَا فُلَانٌ مَوْفِیْہِمْ کَذَا“ یعنی فلاں شخص فلاں جگہ اچانک ہمارے سامنے آیا۔ مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس لفظ ”الصائبین“ سے قرآن مجید میں کیا مراد لیا گیا ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جس نے کسی بھی ایسے دین سے نکل کر سبکو پہلے سے وہ مانتا تھا دوسرا کوئی دین اختیار کر لیا ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اس لفظ سے آیت میں ایک ایسی جماعت مراد لی گئی ہے جس کا کوئی دین نہیں تھا۔ چنانچہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”الصائبین“ وہ جماعت ہے جو نہ یہودی ہے نہ نصرانی اور نہ اس کا کوئی دین ہے۔ ایک روایت میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ صابی یہودیوں اور عیسویوں کے بیچ کا ایک فرقہ تھا ان کا کوئی

دین نہ تھا۔ ہمارے لئے ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ حسن اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی روایت ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا، صابئین کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عراق کا ایک قبیلہ ہے اور نہ عجوسی ہے، نہ یہودی اور نہ نصرانی؟ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے بھی یہ سنا ہے اور مشرکین نے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی فرمایا تھا کہ ”قَدْ صَبَا“ (آپ بے دین ہو گئے نعوذ باللہ) ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے انصاریوں کی تفسیر میں روایت ہے کہ یہ طبقہ جزیرہ موصل میں رہتا تھا اور اس کا اپنا ایک الگ دین تھا۔ یہ لوگ لا الہ الا اللہ کہتے تھے، لیکن نہ کوئی عمل (عبادت) کرتے تھے، لا الہ الا اللہ کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب آسمانی بھی نہیں تھی، اور نہ ان کا کوئی نبی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔ ان کے انھیں خاص عقیدوں کی طرف منسوب کر کے مشرکین عرب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو بھی ”صابی“ کہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ بھی انھیں جیسے ہیں۔ بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ”صابئین“ ایک ایسی جماعت ہے جو فرشتوں کی پوجا کرتی ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ زیادہ گور نہ عراق آنے چھ سے کہہ کہ صابئین قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں۔ بیان کیا کہ زیادہ نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ جزیرہ (جو اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے) ان سے نہ لینا چاہیے۔ بیان کیا کہ پھر بعد میں اسے بتایا گیا کہ وہ تو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ صابئین ایک ایسی قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے۔ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے اور زبور کی تلاوت کرتی ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور کو مانتا ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ ابو جعفر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ صابئین ایک ایسی قوم ہے جو فرشتوں کو پوجتی ہے، زبور کی تلاوت کرتی ہے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے ہیں۔ چنانچہ مدی رحمۃ اللہ علیہ سے ”صابئین“ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ بھی اہل کتاب کی ایک جماعت ہے۔ ”ممن آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلهم اجرهم عند ربہم“ یعنی جس نے اللہ کی تصدیق کی، موت کے بعد قیامت کے دن دوبارہ جی اٹھنے کا اقرار کیا اور نیک عمل کیا یعنی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تو (جو کوئی بھی ایسا کرے گا) ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے، یعنی جو نیک اور صالح اعمال انھوں نے کئے ہوں گے ان کا ثواب ان کے پروردگار کے یہاں سے انھیں ملے گا۔ ”ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصری والصابئین سے جو جملہ شروع ہوا تھا، اسے من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحا فلہم اجرہم عند ربہم پر وہ تمام ہوا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان سب فرقوں میں سے (جن کا ذکر اوپر ہوا) جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اسے اس کا اجر اس کے پروردگار کے یہاں سے ملے گا۔ ”ممن آمن“ کے بعد ان فرقوں کا ذکر دوبارہ اس لئے نہیں کیا کہ پہلے ایک مرتبہ ان کا ذکر آچکا ہے، یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی تو جو بھی ان میں سے

سہ عرب کے شمال و مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر ”صابئین“ (Sabians) نام کا ایک مذہبی فرقہ تھا۔ اس کے مذہبی معتقدات میں بہت سی رائیں ہیں اور بہت سے اہل تحقیق کی روایت ہے کہ یہ لوگ بھی اہل کتاب میں سے تھے جیسا کہ حسن قتادہ اور مدی رحمۃ اللہ علیہ سے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی عراقی تھے اور اس لئے صابیوں سے براہ راست واقفیت کا موقع رکھتے تھے، ان کا یہ فتویٰ ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کے یہاں کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہے۔ یعنی آپ نے بھی انھیں اہل کتاب میں شمار کیا ہے (مترجم)

الشریہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ ”الذین آمنوا“ (جو لوگ ایمان لائے) کا پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ پھر یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ ان سے بھی کہا جاتا ہے کہ ”من آمن باللہ“ (ان میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے) تو جو پہلے ہی سے مومن ہے اس کے دوبارہ ایمان لانے کا کیا مفہوم ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیوں اور نصرانیوں سے جس طرح آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر ایمان لائیں، وہ مفہوم مومن کے سلسلے میں مراد نہیں لیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت میں ”ان الذین آمنوا“ سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو پہلے سے عیسیٰ السلام اور آپ کے دین پر ایمان رکھتے تھے، پھر انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور آپ پر بھی ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ تو آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جو پہلے سے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت پر ایمان لائے، لیکن میرا خیال ہے کہ آیت میں مومن کے ایمان کا مفہوم ایمان پر ثابت قدمی اور اسے تبدیل نہ کرنا ہے۔ رہا یہود نصاریٰ اور صابیوں کے ایمان کا سوال تو ان سے مطالبہ اس کا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شریعت کی تصدیق کریں پس جو شخص بھی ان میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی شریعت اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، پھر اس سے پھرنگا نہیں اور نہ ہمیں کوئی تبدیلی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں سکی موت ہو جائیگی تو اسے عمل کا ثواب و اجر اس کے پروردگار کے پاس سے ملے گا، مومن آمن سے عمل صالح تک فعل وغیرہ واحد کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا، لیکن اسی جملہ میں انھیں کے لئے جن کے لئے اب تک واحد کی ضمیر استعمال ہو رہی تھی ”لہم اجرہم عند ربہم“ میں جمع کی ضمیر استعمال کی کیونکہ اگرچہ لفظ ”من“ کے بعد فعل ”امن“ واحد کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن خود من واحد جمع، مذکر اور مؤنث سب کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اہل عرب ایسے مواقع پر واحد اور جمع دونوں صیغے استعمال کر لیتے ہیں۔

”و لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون“ (نہ کوئی اندیشہ ان کے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے) یعنی جو اعمال انھوں نے اپنی زندگی میں کئے ہیں ان کی وجہ سے قیامت کی ہولناک ساعت میں ان کے لئے کوئی اندیشہ و فکر نہ ہوگا اور نہ انھیں ان چیزوں کا کوئی غم ہوگا جو انھوں نے دنیا میں آرام و راحت کی چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ وہ اس ثواب اور اس جنت کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کر رکھی ہے۔ جن مفسرین نے ”من آمن باللہ“ تا ”لہم اجرہم عند ربہم“ سے مومنین اہل کتاب مراد لئے ہیں ان میں سیدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ آیت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور آپ جیسے دوسرے صحابہ کے بارے میں (جو اسلام سے پہلے اہل کتاب میں تھے) نازل ہوئی ہے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ملک ساہور کے فوجی کمانڈر وں میں سے تھے۔ بادشاہ کے لڑکے سے آپ کی بڑی گہری دوستی تھی، دونوں ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور کبھی جدا نہ ہوتے تھے۔ شکار کیلئے بھی ساتھ ہی جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ شکار کی تلاش میں تھے کہ انھیں ایک جھونپڑا دکھائی دیا۔ دونوں وہاں پہنچے، دیکھا کہ اس میں ایک شخص ہے اس کے سامنے ایک کتاب ہے اور وہ رو رہا ہے۔ انہوں نے اس شخص سے پوچھا، یہ کیا چیز ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص اس کتاب کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے وہ تمہاری طرح گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں سوال کرتا، اگر تم اس کتاب کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے بیچے اتر آؤ تاکہ میں تمہیں تعلیم دوں۔ دونوں سواری سے اتر آئے۔ اب انہوں نے بتایا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، اللہ نے اس میں اپنی طاعت کا حکم دیا ہے اور نافرمانی سے منع کیا ہے، اس میں کہا ہوا ہے کہ ہم زنا نہ کریں۔ چوری نہ کریں۔ اور لوگوں کا مال غلط اور ناجائز طریقوں سے نہ لیں، انھوں نے ان دونوں ساتھیوں کے سامنے اس کے احکام و نواہی تفصیل سے بیان کئے۔ اور وہ کتاب انجیل تھی جسے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا۔ ان دونوں ساتھیوں کے دل میں بات بیٹھ گئی اور یہ ان کے پیر و کار بن گئے اور اسلام لائے۔ ان بزرگ نے دونوں ساتھیوں سے یہ بھی کہا کہ تمہاری قوم کا ذبیحہ تم پر حرام ہے۔ دونوں ان کے پاس آنے جانے لگے اور اللہ کی

کتاب کا علم سیکھتے رہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ کی عید کا دن تھا۔ اس دن اس نے کھانا تیار کروایا اور عوام و اشراف کو جمع کیا۔ شہزادہ کے پاس بھی آدمی بھیجا اور کہلوایا کہ کھانا لوگوں کے ساتھ کھائے۔ لیکن شہزادہ نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے فرصت نہیں، آپ اپنے آدمیوں کے ساتھ تناول فرمائیں۔ لیکن جب بادشاہ نے بار بار آدمی بھیجے تو شہزادہ نے بتایا کہ وہ ان کا کھانا نہیں کھاتا۔ آخر بادشاہ نے آدمی بھیج کر شہزادہ کو بلوایا اور دریافت کیا کہ آخر قصہ کیا ہے؟ شہزادہ نے جواب دیا کہ ہم تمہارا ذبیحہ نہیں کھاتے، کیوں کہ تم لوگ کافر ہو اور تمہارا ذبیحہ جائز نہیں ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ یہ تم سے کس نے کہا؟ شہزادہ نے جواب دیا کہ مجھے فلاں راہب نے بتایا ہے۔ بادشاہ نے راہب کو بلوایا اور پوچھا کہ یہ میرا بیٹا کس طرح کی باتیں کر رہا ہے؟ راہب نے جواب دیا کہ سچ کہہ رہا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر خون بہانا ہمارے یہاں بہت بڑا پاپ نہ ہوتا تو میں تمہیں قتل کر ڈالتا، اب تم ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔ مسلمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ان کی اس جلا وطنی پر ہم رونے لگے۔ لیکن ان راہب نے کہا کہ اگر واقعی تم سچے ہو تو میں موصل میں اپنے ان ساتھی آدمیوں کے ساتھ قیام کروں گا جنہوں نے تم سے بیعت کی ہے۔ ہم وہاں اللہ کی عبادت (آزادی کے ساتھ) کریں گے، تم لوگ بھی وہیں آ جانا۔ چنانچہ راہب اس ملک سے نکل گئے۔ مسلمان رضی اللہ عنہ اور شہزادہ ابھی وہیں تھے (اب مسلمان رضی اللہ عنہ شہزادہ سے راہب کے پاس چلنے کے لئے کہتے تو شہزادہ صرف ہاں کر کے رہ جاتا۔ اس عرصہ میں سفر کی تیاری کے لئے شہزادہ اپنا مال و اسباب بچتا رہا، لیکن جب بہت تاخیر ہو گئی تو مسلمان رضی اللہ عنہ تنہا نکل پڑے۔ آخر آپ راہب کے پاس پہنچ گئے۔ اور وہیں قیام کیا۔ مسلمان رضی اللہ عنہ اس راہب کے ساتھ عبادت و ریاضت کرنے لگے۔ اتنی ریاضت کرتے کہ تھک جاتے۔ اس لئے راہب نے ان سے کہا کہ تم ابھی نو عمر ہو اور عبادت و ریاضت اتنی زیادہ کرتے ہو جس کی تم میں طاقت نہیں، مجھے ڈر ہے کہ اس کثرت عبادت کے نتیجے میں کہیں تم عاجز نہ ہو جاؤ، اپنے اوپر رحم کرو، عبادت میں کمی کرو۔ مسلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ عبادت میں وہ طریقہ افضل ہے جس کا آپ مجھے مشہور رہ دے رہے ہیں یا وہ افضل ہے جو میں کرتا ہوں؟ راہب نے بتایا ہے کہ افضل تو وہی ہے جو تم کرتے ہو۔ اس پر آپ نے کہا کہ پھر مجھے عبادت و ریاضت اپنے طریقہ پر کرنے دیجئے۔ اس کے بعد راہب نے آپ کو بلایا اور آپ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ بیعت (عہد) جو تم نے مجھ سے کیا ہے، میری ہے اور میں ہی اس کا تمام دوسرے لوگوں سے زیادہ مستحق ہوں لیکن اب میں ضعیف ہو گیا ہوں اور اس بیعت کے مطابق جو عبادتیں مجھے کرنی چاہئے تھیں انہیں میں نہیں داکر سکتا، اس لئے میرا ارادہ ہے کہ اس بیعت کے بجائے ایک دوسری بیعت کروں جس کی عبادت و ریاضت اس کے مقابلے میں خفیف اور ہلکی ہو۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ یہیں قیام کرو (اور پہلی بیعت کے مطابق ریاضت کرو) تو تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو اس کا بھی تمہیں اختیار ہے۔ مسلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں بیعتوں میں افضل کون ہے؟ راہب نے بتایا کہ یہی جس پر تم اب ہو۔ مسلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر میں اسی پر قائم رہوں گا۔ چنانچہ آپ اسی پر قائم رہے۔ وہ راہب بیعت کے عالم کو مسلمان رضی اللہ عنہ کے متعلق و ہیت کر گئے۔ اس کے بعد آپ انھیں لوگوں کے ساتھ عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ پھر ان شیخ عالم کا ارادہ بیت المقدس جانے کا ہوا۔ انہوں نے مسلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم بھی میرے ساتھ چلنا چاہو تو چل سکتے ہو، اور اگر نہیں ٹھہرنا چاہو تو اس کا بھی تمہیں اختیار ہے۔ مسلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ ان دونوں میں افضل کیا ہے۔ آپ کے ساتھ چلنا یا یہیں ٹھہرنا؟ انہوں نے بتایا کہ میرے ساتھ چلنا افضل ہے۔ آپ نے کہا کہ پھر میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ چنانچہ آپ ان کے ساتھ بیت المقدس گئے۔ راستے میں ایک گڈر ایک ایاج شخص سے ہوا جو راستے پر اوندھا پڑا تھا۔ جب اس نے ان دونوں کو دیکھا تو آواز دی کہ اے راہبوں کے سردار! مجھ پر رحم کیجئے، اللہ آپ پر رحم کرے گا۔ لیکن انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ دونوں وہاں سے گذر گئے اور آخر بیت المقدس پہنچے۔ شیخ نے مسلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب جاؤ اور علم حاصل کرو۔ اس مسجد (اقصیٰ) میں سرزمین مقدس کے علماء آتے ہیں۔ مسلمان رضی اللہ عنہ نکل پڑے اور ان سے علم سیکھنے لگے۔ ایک دن آپ بہت غمگین واپس لوٹے تو شیخ نے

اُن سے پوچھا، سلمان! کیا بات ہے؟ آپ نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ تمام خیر و بھلائی ان انبیاء اور ان کی اتباع کرنے والوں کے ساتھ ختم ہو گئی جو ہم سے پہلے اس دنیا میں تھے۔ اس پر سچ نے کہا، سلمان! رنج و غم نہ کھاؤ، ابھی ایک نبی اور باقی رہ گئے ہیں، کوئی نبی ایسا نہیں گذرا ہے جس کے ان سے افضل اور بہتر اتباع کرنے والے رہے ہوں، ان کا زمانہ یہی ہے اس زمانہ میں اُن کی بعثت ہوگی، میں نہیں سمجھتا کہ میں بھی انہیں پاسکوں گا، ہاں تم ابھی جوان ہو، ممکن ہے تمہیں وہ مل جائیں، ان کی بعثت عرب کی سرزمین پر ہوگی، اگر تم انہیں پاسکو تو ان پر ایمان لانا اور ان کی اتباع کرنا۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھے مبعوث ہونے والے نبی کی کچھ نشانیوں بتادیں شیخ نے کہا، ہاں، ان کی بیٹھ پر "خاتم نبوة" کی مہر ہوگی، وہ ہدیہ کھالیں گے، لیکن صدقہ نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد دونوں حضرات وہاں سے واپس ہوئے۔ راستے میں پھر وہاں پہنچے جہاں وہ اپنا سچ راستے پر پڑا ہوا تھا اس نے پھر انہیں آواز دی کہ اے راہبوں کے سردار! مجھ پر رحم کیجئے، اللہ آپ پر رحم کرے گا اس مرتبہ انہوں نے اپنا گدھا اس کی طرف پھیر دیا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کے زمین پر کھڑا کیا اور اس کے لئے دعا کی اور کہا کھڑا ہو جا اللہ کے حکم سے، چنانچہ وہ صحیح سالم کھڑا ہو گیا اور بڑی تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ سلمان رضی اللہ عنہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اتنے میں راہب وہاں سے روانہ ہو گئے اور سلمان رضی اللہ عنہ کی نظر سے اوجھل ہو گئے، آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ لیکن یورپ میں بہت گھبرائے اور اُن کی تلاش شروع کی۔ اس دوران میں آپ کی ملاقات عرب کے قبیلہ کلب کے دو آدمیوں سے ہوئی۔ آپ نے اُن سے پوچھا کیا تم نے راہب کو دیکھا ہے؟ ان میں سے ایک نے اپنی اونٹنی بٹھائی اور بولا، ہاں، یہ ہے اونٹنیوں کا چرواہا! اس نے آپ کو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور آپ کو لیکر مدینہ پہنچا۔ سلمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس واقعہ سے مجھے اتنا صدمہ پہنچا کہ اپنی زندگی میں کبھی اتنا صدمہ کسی واقعہ سے بھی نہیں پہنچا تھا۔ پھر آپ کو قبیلہ حنینہ کی ایک عورت نے خرید لیا۔ آپ اور اس کا ایک اور غلام اس کی بکریاں چراتے تھے۔ باری مقرر کر لی تھی ایک دن آپ چرانے لیجاتے اور ایک دن وہ غلام۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے درحکم صحیح کرنا شروع کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک دن آپ بکریاں چرا رہے تھے کہ ان کا چرانے میں شریک غلام ساٹھی آیا اور کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے۔ آج مدینہ میں ایک شخص آیا ہے جس کا خیال ہے کہ وہ نبی ہے۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا جنتک میں واپس آؤں بکریوں کی دیکھ بھال تم کرتے رہو چنانچہ آپ مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ آنحضرت کے چاروں طرف گھومنے لگے خاتم نبوة کے ہر دیکھنے کے لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر آپ پر پڑی تو آپ کا مقصد بھانپ گئے اور اپنا کپڑا اگر ادا دیا اور آنحضرت کی ختم نبوة کھل گئی جب سلمان رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا تو آپ آنحضرت کے سامنے آئے اور آپ سے گفتگو کی۔ اس کے بعد وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک دینار سے بکری کا گوشت اور روٹی خریدی اور اسے لیکر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا، یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ صدقہ ہے۔ آنحضرت نے فرمایا، تجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے (محتاج) مسلمانوں کو کھلا دو۔ پھر آپ وہاں سے چلے آئے۔ اور دوسرے دینار روٹی اور گوشت خریدی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لیکر حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ ہدیہ ہے۔ آنحضرت نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ آپ بیٹھ گئے اور سب نے بالکر اسے کھایا۔ پھر گفتگو کے دوران میں سلمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کا ذکر کیا اور ان کے حالات آپ کو بتائے، کہا کہ وہ روزے رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور آپ پر ایمان رکھتے کہ آپ نبی بنا کر بھیجے جائیں گے۔ جب سلمان رضی اللہ عنہ ان کی تعریف و توصیف کر چکے تو آنحضرت نے فرمایا، اے سلمان! وہ جہنمی تھے۔ سلمان رضی اللہ عنہ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ آپ آنحضرت سے یہ بھی کہہ چکے تھے کہ اگر وہ لوگ آپ کا زمانہ پاتے تو آپ کی نقد بقی کرتے اور آپ کی اتباع کرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی "یشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئی، (غرض) جو کوئی بھی اللہ پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے سو ان سب کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے" تو یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ... تو رات پر ایمان

لائیں اور اسپر اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کریں یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے جب آپ کی بعثت ہوئی تو جو شخص تورات پر ایمان رکھتا اور اسپر اور موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتا، لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرتا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نصاریٰ کا ایمان یہ تھا کہ ان میں سے جو شخص بھی انجیل کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتا اور عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر عمل کرتا تو وہ مومن اور مقبول بندہ تھا یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اب ان میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کرے گا تو وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

آیت کی تفسیر میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ اور ان کے اعمال کا ذکر کیا جو انہوں نے خود دیکھا تھا تو آنحضرت نے فرمایا کہ ان کی موت اسلام پر نہیں ہوتی۔ سلمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ آنحضرت کے اس ارشاد کے بعد دنیا میرے لئے اندھیری ہو گئی۔ انہوں نے ان نصاریٰ کی عبادت دریافت میں مشقتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آنحضرت نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا کہ آیت تمہارے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد آنحضرت نے فرمایا کہ جو شخص عیسیٰ السلام کے دین پر اور اس پر ایمان لانے کی حالت میں میری بعثت کی اطلاع سے پہلے مر گیا تو وہ خیر و بھلائی پر مرے گا۔ لیکن آج جس شخص کو بھی میری بعثت کی اطلاع ہو گئی اور پھر بھی مجھ پر ایمان نہیں لایا تو وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ مذکورہ بالا آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی تھی "وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْآسِفِينَ" اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہو گا) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود نصاریٰ اور صابئین کے ان افراد سے جو عمل صالح کریں آخرت میں جنت کا وعدہ کیا تھا ان الذین آمنوا والذین ہادوا سے آخر تک والی آیت میں، لیکن پھر اس حکم کو مذکورہ بالا آیت "اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا" سے منسوخ کر دیا۔ اس لئے مجاہد اور سدی رحمہما اللہ کے واسطے سے جو روایت ہم نے ذکر کی ہے اس کی بنیاد پر آیت کی تفسیر یہ ہو گی کہ "بیشک جو لوگ ایمان لائے ہیں اس امت میں سے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، تو یہود، نصاریٰ اور صابئین میں سے جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے، ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے" لیکن جو تفسیر آیت کی ہم نے پہلے بیان کی ہے وہی قرآن مجید کی ترتیب سے واضح اور ظاہر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح پر اجر و ثواب کے لئے اپنی مخلوق کے کسی طبقہ کو خاص نہیں کیا ہے کہ ایک طبقہ کو تو اجر و ثواب ملے گا اور دوسرے کو نہیں ملے گا، اس لئے من آمن باللہ والیوم الآخر سے جو اطلاع دی جا رہی ہے وہ ان تمام طبقوں کو شامل ہو گی جنکا ذکر آیت کے شروع میں ہوا ہے۔

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا قَلَمَ الطُّورِ خَذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا کہ توراہ پر عمل کریں گے اور اپنے طور پر یہاں کو اٹھا کر تمہارا اوپر رعاذات میں منقح کر دیا اور کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کیساتھ

اذْكُرُوا مَا فِيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

یا درگھوڑا (حکم) اس کتاب میں ہیں جس پر توقع ہو کہ تم منقح بن جاؤ پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا

عَلَيْكُمْ وَمَا رَحْمَتُ اللّٰهِ كُنْتُمْ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

(تو اس عہد شکنی کا مقتضایہ تھا کہ) اگر تم (فوراً) تباہ اور ہلاک ہو جاتے۔

”واذا اخذنا ميثاقكم“ اور وہ وقت بھی یاد کر جب ہم نے تم سے میثاق (عہد لیا)۔ ”میشاق“ مفعول کے وزن پر ”وَرَيْقَةٌ“ (قابل اعتماد، کام کی مضبوطی) سے نکلا ہے۔ میثاق (عہد) قسم کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے، وعدہ اور اس کے علاوہ دوسری قابل اعتماد چیزوں کے ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ ”واذا اخذنا ميثاقكم“ میں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر کیا ہے کہ اسے بنی اسرائیل سے لیا تھا ”وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا“ اور وہ وقت یاد کر جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ عبادت نہ کرنا کسی کی بجز اللہ کے اور جس سلوک سے پیش آنا اپنے ماں باپ سے اور دوسری آیات جو اس کے بعد ذکر ہوئی ہیں۔ بنی اسرائیل سے میثاق لئے جانے کے سبب کا ذکر ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے پاس سے الواح (جن پر تورات لکھی ہوئی تھی) لیکر واپس آئے تو اپنی قوم بنی اسرائیل سے فرمایا کہ ان الواح میں اللہ کی کتاب ہے اور اس کے احکام ہیں جن کا اس نے ہمیں حکم دیا ہے اور اس کی حرام کی ہوتی چیزوں کا ذکر ہے جن سے اُس نے تمہیں روکا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ تمہاری تنہا کی بات کا کون یقین کرے گا، نہیں خدا کی قسم، ہم اس وقت تک یقین نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کو ہم خود نہ دیکھ لیں اور وہ ہمارے سامنے نہ آجائے اور وہ خود کہے کہ یہ میری کتاب ہے، اس پر تم لوگ عمل کرو، آخر اللہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ خود ہم سے بات نہیں کرتا۔ بیان کیا کہ اس پر اللہ کا غضب انہیں نازل ہوا اور ایک کٹر ک نے ان سب کی جان لے لی۔ بیان کیا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پھر کہا کہ اللہ کی کتاب پر ایمان لاؤ لیکن وہ اب بھی اپنے انکار پر مصر رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو بھیجا اور انہوں نے پہاڑ کو ان کے اوپر لٹکا دیا۔ اس وقت ان سے پوچھا گیا، کیا اسے بھی پہنچا۔ تے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں یہ طور ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ کتاب اللہ پر ایمان لاؤ ورنہ ہم اس پہاڑ کو تمہارے اوپر ڈال دیں گے۔ اس وقت انہوں نے میثاق (عہد) کیا تھا۔ آپ نے اس آیت کی تلاوت کی ”وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا“ سے وما اللہ بغافل عما تعملون“ تک۔ بیان کیا گیا کہ اگر بنی اسرائیل کتاب اللہ پر پہلی ہی مرتبہ ایمان لائے ہوتے تو ان سے میثاق نہ لیا جاتا۔

طور اور فعضا فو قکم الطور“ (اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا) ”طور“ کلام عرب میں پہاڑ کے معنی میں آتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ طور ایک خاص پہاڑ کا نام ہے، بیان کیا گیا کہ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے سرگوشی کی تھی بعض مفسرین کا خیال ہے کہ طور ایسے پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگتا ہو، خشک پہاڑ کو نہیں کہتے۔ مجاہد رحمۃ اللہ نے اس سے عام پہاڑ مراد لیا ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا تھا کہ دروازہ سے بھٹکتے ہوئے شہر کے اندر داخل ہوں اور یہ کہتے ہوئے کہ توبہ ہے لیکن وہ نہیں بھٹکے، بلکہ سرسین کے بل گھسٹتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور (مِثَاقًا عِنِّي تَوْبَةً) کے جگمگاتے ہوئے (کہیں) کہا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو ان کے اوپر معلق کر دیا۔ آپ نے بیان کیا کہ پہاڑ کو زمین میں سے جڑ سے اکھاڑ لیا گیا انہیں ڈرانے کے لئے ان کے اوپر چھتری کی طرح لٹکا دیا گیا۔ سریانی زبان میں طور پہاڑ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر انہوں نے سرگوشی کا یا اور اس وقت بھی کن انکھیں سے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ رب العزت نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلی کی تھی۔ ایک روایت میں آپ سے ہے کہ بادل کی طرح اُن کے اوپر پہاڑ لٹکا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ ورنہ تمہارے اوپر گر دیا جائے گا۔ پھر وہ ایمان لائے۔ اور سریانی زبان میں پہاڑ کے لئے طور کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ تمادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ابو العالیہ اور عکرمہ رحمہما اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں صدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ کو حکم دیا کہ ان پر گر پڑے۔ جب پہاڑ ان پر گرنے لگا اور وہ اس کی زد میں آگئے تو انہوں نے اس کی طرف دیکھا اور سجدہ میں گر گئے لیکن یہ بھی ایک پہلو سے کیا، دوسری طرف سے پہاڑ ہی۔ کون دیکھتے رہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کو ان پر رحم آیا اور پہاڑ کو گرنے سے منع کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”وَإِذْ نُنَقِّنَا لُجْبَانَ قَوْمِ قَاهِلَانَ فَكَانَ نَارًا مُّظَلَّةً“ اور وہ وقت یاد کر جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ معلق کر دیا تھا اس طرح کہ گویا وہ سا بان ہے) اور ”وَدَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ“ (اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا) میں اسی

واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ پہاڑ کیلئے سریانی میں طور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ طور اس مخصوص پہاڑی کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے سرگوشی کی تھی، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طور وہ پہاڑی ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی تھی اور بنی اسرائیل اس وقت اس کے نیچے موجود تھے عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ پہاڑی ان کے اوپر بلند کر دی گئی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ تورات پر ایمان لاؤ ورنہ یہ تمہارے اوپر گرا دی جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ طور خاص اس پہاڑی کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگتا ہو۔ جس پر سبزہ نہ آئے اُسے طور نہیں کہتے۔

حق پر استقلال کیلئے فہمالتش

”خذوا ما آتیناکم بقوۃ“ (مضبوطی کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ رکھو جو ہم نے تم کو دی ہے) بصرہ کے بعض نحویوں کا خیال ہے کہ آیت میں کچھ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں، کیونکہ آیت کی ترتیب سے پڑھنے والا انہیں خود سمجھ سکتا تھا، اس لئے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”اور ہم نے ان سے کہا کہ مضبوطی کے ساتھ اس کتاب کو پکڑ رکھو جو ہم نے تم کو دی ہے ورنہ اس پہاڑ کو ہم تمہارے اوپر پھینک ماریں گے، لیکن کوہ کے بعض نحویوں کا کہنا ہے کہ قلنا ہم نے کہا اے کوہ حذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اخذ میثاق کا ذکر ہوا ہے اور وہ خود قول ہے۔ البتہ ”ان“ حذف مانا جاسکتا ہے، جیسے ”مَرَاتَا اُرْسَلْنَا نُوَجِّا اِلٰی قَوْمٍ اَنْ اَنْذَرُوْهُمْ قَوْمًا مِّنْ اَنْ يَّكُوْرُوْهُمْ۔“ ”خذوا ما آتیناکم“ سے مراد یہ ہے کہ جن باتوں کا تورات میں ہم نے تمہیں حکم دیا ہے۔ ایتنا، اصل میں اعطاء (دینا) کے معنی میں آتا ہے اور ”بقوۃ“ کا مفہوم ہے کہ جو چیزیں تورات میں تم پر فرض ہوئی ہیں اور جن کا حکم ہوا ہے انہیں پوری پابندی اور استقلال کے ساتھ ادا کرو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”خذوا ما آتیناکم بقوۃ“ یعنی تورات میں جو کچھ ہے اس پر عمل کرو۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مطالبہ طاعت کا ہے۔ فتاویٰ اور مستدعی رحمہما اللہ سے عمل میں کوشش اور تندہی نقل ہوئی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جو کتاب موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اسے اخلاص اور حق کے ساتھ پکڑ لو اس لئے آیت کی تفسیر یہ ہو گی کہ جو چیزیں ہم نے اپنی کتاب میں تم پر فرض کر دی ہیں انہیں مان لو اور پھر پوری جدوجہد کے ساتھ ان پر عمل کرو، عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔ مضبوطی کیساتھ پکڑنے کا یہی مفہوم ہے ”واذکروا ما فیہ لعلکم تتقون“ یعنی اپنی کتاب میں ہم نے تمہیں جو وعید دنا فرمائی ہے اور وعدہ (فرمانبرداری طاعت ہے) اور ترغیب و ترہیب کی ہے اسے قبول کرو اور اس سے عبرت حاصل کرو اور ان پر غور و فکر کرو، کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم مستحق عذاب بن جاؤ گے اور میرے عذاب سے ڈرنے لگو گے۔ پھر تمہیں اپنی گمراہی پر اصرار نہیں رہے گا اور بالآخر تم میری طاعت و عبادت کی طرف لوٹ آؤ گے، میری نافرمانی چھوڑ دو گے، ”لعلکم تتقون“ کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”تا کہ تم ان اعمال سے باز آ جاؤ جنہیں اب تک کرتے رہے ہو“ اور انہیں اللہ تعالیٰ نے تورات دی تھی جس کے احکام کو یاد رکھنے کا انہیں حکم ہوا ہے) (الربیع اور ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”واذکروا ما فیہ“ یعنی جو کچھ اس میں ہے اسے اللہ کی طاعت اور اخلاص کے ساتھ یاد رکھو۔ آپ نے فرمایا، یعنی جو کچھ بھی اس میں ہے اسے یاد رکھو، اسے بھولو مت اور نہ اس سے کبھی غافل ہو۔

پھر وہی تلوون

”ثم تولیتکم من بعد ذالک“ یعنی پھر تم اس عہد سے اس کے بعد پھر گئے۔ ”تولیتکم“ وَاٰتٰی فُلَانًا دُبُوْرًا“ سے نکلا ہے۔ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص پشت پھیر لے اور اعراض کرے۔ پھر اس لفظ کا اطلاق ہر اس شخص پر ہونے لگا جو اللہ کی طاعت اور اس کے حکم کا تارک اور اس سے رد گردانی کرنے والا ہو۔ بولتے ہیں ”تولیت فُلَانًا“ عن طاعی فُلَانًا“ (فلاں نے فلاں کی فرمانبرداری نہیں کی) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ”فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوْا بِہٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ“ (پھر اللہ نے جب ان کو اپنے فضل سے مال دے دیا تو ان کے وہ اس میں بخل کرنے اور رد گردانی کرنے اور منہ پھیرے ہوئے تو وہ

تھری (میں تو گواہی سے ہی معنی مراد لیا گیا ہے، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا کہ "لَا تَأْتِيَنَّكُمْ مِنْ الْقَارِحِينَ" کہ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں مال عطا کر دے تو ہم خوب اس میں سے صدقہ کریں گے اور ہم خوب نیک کام کریں گے) اس کے انہوں نے خلاف کیا اور اپنے اس وعدہ کو پس پشت ڈال دیا، کلام عرب میں استعارہ کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، ایک کلمہ کو اس کے ہم معنی دوسرے کلمہ کے بجائے کلام میں استعمال کا ان کے ہاں عام رواج ہے۔ "ثم توليتهم من بعد ذلك" کا مطلب یہ ہو گا کہ تم سے ہم نے کتاب اللہ پر عمل اور اس کے احکام کی بجا آوری میں جدوجہد کا جو عہد و میثاق لیا تھا، تم نے اس پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ تم نے اسے پس پشت ڈال دیا، حالانکہ تم نے اپنے پروردگار سے اس پر عمل کا عہد کیا تھا۔ پہلی آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے ان سب کی طرف "ذالك" سے اشارہ ہے یعنی "واذا اخذنا ميثاقكم درفعنا فوقكم الطور" میں "فلولا فضل الله ورحمته لكنتم من الخاسرين" (پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں ہوتے یعنی تمہاری عہد شکنی کے بعد تمہیں توبہ کی توفیق دیکر اللہ تعالیٰ نے اگر تم پر اپنا فضل نہ کیا ہوتا کہ جب تم پر طور کو بلند کیا تو تم نے عہد کر لیا کہ اب اللہ کی طاعت اور اس کے فراموش کی بجا آوری میں پوری کوشش کرو گے اور کوئی ایسا کام نہیں کرو گے جس کی ممانعت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی تمہیں توفیق دیکر اپنا انعام اور اپنی رحمت تم پر کی اور تمہاری خطاؤں کو معاف کیا اس کے بعد پھر اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم یقیناً تباہ ہونے والوں میں ہو جاتے۔ آیت کے مخاطب اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں لیکن واقعہ ان کے اسلاف کا ہے، جیسا کہ کئی مرتبہ اس سلسلہ میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ عرب میں عام دستور تھا کہ ایک قبیلہ کا کوئی شخص دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کو خزا اور اپنی بڑائی کرتے وقت اگر مخاطب کو تا تو واقعات اپنے اور اس کے اسلاف کے بیان کرتا، لیکن انہیں منسوب اپنی اور ان کی طرف کرتا جو اس وقت زندہ اور موجود ہوتے، کہتا کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ کیا اور یہ کیلئے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضور اکرم کے دور کے یہودیوں کو اس لئے خطاب کیا گیا کہ اپنے اسلاف کی طرح ان کا بھی طرز عمل تھا اور یہ بھی وہی کرتے تھے جس کے ان کے اسلاف عادی تھے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضور اکرم کے دور کے یہودی چونکہ اپنے اسلاف کی ان خطاؤں سے واقف تھے اس لئے انھیں مخاطب کیا گیا ہے اس لئے مفہوم یہ ہو گا کہ چونکہ حضور اکرم کے زمانہ کے یہودی ان واقعات سے واقف تھے اس لئے ان کے واقعات کو بیان کرتے وقت ان کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ مخاطب کلام کے مقصد کو خود سمجھ لے گا۔ اس سلسلہ میں ہم نے سب سے پہلے جو تفسیر ذکر کی ہے وہی کلام عرب میں عام طور سے رائج ہے چنانچہ اس کے مطابق ابوالباقیہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ اللہ کا فضل اسلام ہے اور اس کی رحمت قرآن مجید ہے۔ "خسبان" کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ آتَيْنَاكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْتُمْ كُفُّوا فِرْدًا

اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال بھول گئے تم میں سے (شرع) سے تمہارا ذکر کیا تھا دربارہ اس حکم کے جو یوم السبت کے متعلق تھا) سو ہم نے ان کو کہہ دیا کہ تم بندہ ذلیل بن جاؤ

خَاسِرِينَ ۝ فَجَعَلْنَا نَكَالًا لِّمَآبِتِنَ يَدَيَّهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ

پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ عبرت) بنا دیا ان لوگوں کے لئے جی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو بعد زمانہ میں آتے رہے

مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝

اور انہیں اس واقعہ کو موجب نصیحت بنایا (خدا سے ڈرنیوالوں کیلئے)۔

حد سے تجاوز

”ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت“ (اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا) لقد علمتم یعنی تم خوب پہچانتے ہو۔ بولتے ہیں: عَلِمْتُ أَخَاكَ وَ لَمْ أَكُنْ أَعْلَمُهُ، یعنی تمہارے

بھائی کو میں نے پہچان لیا، پہلے میں اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اسی معنی میں اللہ کا یہ ارشاد ہے: ”أَخْرَجْنَا مِنْ دُونِهِمْ لَأَعْلَمَ نَامُ اللَّهِ يَعْلَمُهُمْ“ (اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم انہیں نہیں پہچانتے اللہ انہیں پہچانتا ہے) الذین اعتدوا منکم فی السبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے میری مقرر کردہ حد سے تجاوز کیا اور سبت (سینچر) کے دن جس چیز سے میں نے انہیں روکا تھا اسے انہوں نے کیا، اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ”اعتداء“ حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں بھی مدینہ کے انہیں یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے اور جن کا ذکر اس سورہ کی ابتدا سے ہونا آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں کو متنبیہ کرتا ہے کہ ان کے اسلاف نے اپنے زمانہ کے انبیاء کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کر رکھا تھا اور جس طرح اللہ کے احکام میں وہ حد سے تجاوز کرتے تھے اور اپنے کفر و عصیان پر اڑے رہتے تھے کچھ وہی معاملہ ان کا بھی حضور اکرم کے ساتھ ہے اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ کا غضب اور اس کا عذاب ان پر بھی نازل ہو سکتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”لقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت“ میں یہودیوں کو نافرمانی اور معصیت پر تنذیر و تنبیہ ہے، اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے، ڈرو کہ کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو سبت (سینچر) کے دن کے متعلق میرے حکم سے تجاوز کرنے والے تمہارے اسلاف بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ ”اعتدوا“ یعنی سینچر کے دن اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی انہوں نے جرت کی۔ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو جمعہ کے متعلق حکم دیا تھا اور اس کی فضیلت بتائی تھی، آسمان پر بھی فرشتوں کو اس دن کی تعظیم کا حکم ہے اور قیامت بھی اسی دن قائم ہوگی۔ اس لئے پچھلی جتنی امتیں اپنے انبیاء پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت آپ پر ایمان لائی ہے تو انہوں نے جمعہ کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ قبول کیا اور اس سلسلے میں بھی سمح و طاعت اختیار کی، اس دن کی فضیلت کو پہچانا اور ان احکام کو جو اللہ تعالیٰ اس دن سے متعلق رکھے تھے بجالائے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا وہ ان حد سے تجاوز کرنے والوں کی جماعت میں شامل ہو گئے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے کہ ”تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بند رہو جاؤ“ اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو جمعہ کے دن کی تعظیم کا حکم دیا اور اس کی فضیلت انہیں بتائی تو وہ کہنے لگے، اے موسیٰ! آپ ہمیں اس دن کی تعظیم کا کس طرح حکم دیتے ہیں اور اس دن کو تمام دنوں پر کیوں فضیلت دیتے ہیں، افضل تو سبت (سینچر) کا دن ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین اور روزی ہفتہ کے چھ دنوں میں پیدا کی اور اسی سینچر کے دن تمام چیزیں اللہ کی اطاعت پر مستقر ہو گئیں۔ ہفتہ کا آخری دن بھی یہی ہے۔ بیان کہ اسی طرح جب عیسیٰ ابن مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام نے لھاری سے جمعہ کی تعظیم کے کہا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ جمعہ کی تعظیم کا ہمیں کس طرح حکم دیتے ہیں، ہفتہ کا سب سے پہلا دن سب سے افضل اور سب کا سردار ہوتا ہے یعنی اتوار اور اللہ ایک ہے اور پہلا دن (دن) بھی ایک ہے جو افضل ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ انہیں اتوار کی ہی تعظیم کرنے دو، البتہ اس دن انہیں فلاں فلاں چیزیں کرنی ہونگی لیکن انہوں نے اللہ کے حکم کے مطابق عمل نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کا واقعہ اپنی کتاب میں بیان کیا۔ بیان کیا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بھی فرمایا تھا، جب یہودی سینچر کی فضیلت پر مصر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں سینچر کی تعظیم کرنے دو، لیکن انہیں حکم ہے کہ اس دن ٹھیلی یا کسی اور چیز کا شکار نہ کریں اور اس دن کوئی دو سرہ کام بھی نہ کریں جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔ بیان کیا کہ پھر سینچر کے دن ٹھیلیاں پانی کی سطح پر آجایا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ”إِذْ تَأْتِيهِمْ جِثًا تُثَمُّ يَوْمَ نَعِيْتِهِمْ وَشَوْءًا“ (جبکہ ان کے سبت کے روز ان کی ٹھیلیاں ظاہر ہوتی تھیں) میں یہی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پانی کی سطح پر ٹھیلیاں آجاتی تھیں، ایسا اس لئے ہوتا تھا کہ انہوں نے اس معاملہ میں موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی۔ لیکن باقی دوسرے دنوں میں ٹھیلیاں دستور

کے مطابق پانی کے اندر ہی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”ذُكُوْمٌ لَا يَسْتَوْنَ لَكَ تَبْلِيْهُمُ“ اور جب سبت نہ ہوتا تو نہ آتی تھیں (میں اس واقعہ کا دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ مچھلیاں یہ سب کچھ اللہ کے منشا کے مطابق کرتی تھیں۔ مچھلیوں کو سینچر کے دن جب بنی اسرائیل نے اس طرح پانی کی سطح پر دیکھا تو ان کے دل میں لالچ پیدا ہوا کہ انھیں پکڑیں۔ لیکن سزا کا خوف بھی دامن گیر تھا۔ اس کے باوجود ان میں چند ایسے تھے جنہوں نے اس دن مچھلی پکڑی ہی لی، اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے جس سزا سے انھیں ڈرایا تھا اس سے وہ خوف زدہ بھی تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی سزا اور عذاب ان پر نہیں آیا تو انہوں نے دوبارہ پھر سینچر کے دن مچھلی پکڑی، بعضوں نے دوسروں سے بھی کہہ دیا کہ انہوں نے مچھلی پکڑی تھی اور ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔ اس کے نتیجے میں مچھلی پکڑنے والوں کا اگلے سینچر کو هجوم ہو گیا، انہوں نے سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات بالکل غلط تھی۔ اسی واقعہ کا ذکر اس آیت میں ہے کہ ”وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اَعْتَدْنَا لَكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْتُمْ لِمَ كُوْنُوْا قَوْمًا خَاسِرِيْنَ“ (اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے سبت کے بارے میں سجاوٹ کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بند رہو جاؤ) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انھیں لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے سینچر کے دن مچھلی کا شکار کیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے انھیں مسخ کر کے بندر بنا دیا، وہ بندر روئے زمین پر زمین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے، مسخ ہونے کے بعد انہوں نے کھایا نہ پیا اور نہ ان کی نسل چلی۔ اللہ تعالیٰ نے بندر، سور اور تمام مخلوق انھیں چھ دنوں میں پیدا کی تھی جن کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں (آسمان و زمین کی پیدائش کے سلسلے میں) کیا ہے، لیکن بنی اسرائیل کے ان نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بندر کی صورت میں مسخ کیا تھا (اور ان کی نسل نہیں چلی تھی نہ وہ زندہ رہے تھے) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے نقل ہے کہ جس طرح تمہاری عید کے لئے جمعہ کا دن نمبر اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، بنی اسرائیل کی عید کے لئے بھی یہی دن فرض کیا تھا، لیکن انہوں نے نافرمانی کر کے سینچر کا دن اختیار کر لیا اور اس دن کی تقظیم کرنے لگے اور اللہ کے حکم کو چھوڑ دیا جب انہوں نے خود ہی سینچر پر بہت اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس دن کے سلسلے میں آزمائش میں ڈالا اور ان پر وہ چیزیں اس دن حرام کر دیں جو ان کے لئے باقی دنوں میں حلال تھی۔ بنی اسرائیل کی یہ جماعت مقام ایلا اور کوہ طور کے درمیان مدین نامی ایک بستی میں رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سینچر کے دن مچھلی کا شکار اور اس کا کھانا حرام کر دیا۔ ادھر سینچر کے دن ساحل سمندر کی طرف سے مچھلیوں کے جھنڈے جھنڈان کی طرف آتے تھے لیکن سینچر کا دن گزرتے ہی تمام مچھلیاں پھر سمندر میں چلی جاتیں اور چھوٹی بڑی کسی طرح کی مچھلی بھی انھیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ پھر جب سینچر آتا تو مچھلیوں کا جھنڈا اسی طرح ان کی طرف بہتا چلا آتا اور دن کے گزرتے ہی غائب ہو جاتا۔ اس طرح جب بہت دن گزر گئے تو خراب سینچر کو انہیں سے ایک شخص نے چھپ کے ایک مچھلی پکڑی لی۔ لیکن اسے دھاگے میں باندھ کے پانی میں ڈال دیا اور کنارے ایک کھونٹی زمین پر گاڑ کر دھاگے کا دوسرا سر اس کھونٹی میں باندھ دیا اور دوسرے دن آکر اسے پانی میں سے نکال لیا اس نے کہا کہ سینچر کے دن میں نے مچھلی نہیں پکڑی ہے۔ آخر وہ مچھلی کو لیکے اپنے گھر گیا اور اسے کھایا۔ اگلے سینچر کو بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ محلہ والوں نے بھی مچھلی کی بوسوٹھی اور گھنٹے لگا کر مچھلی کی بو آ رہی ہے۔ اس شخص نے جس ترکیب سے مچھلی پکڑی تھی انھیں بھی اس کا علم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے بھی (جنھیں یہ ترکیب معلوم ہو گئی تھی) اسی شخص کی طرح مچھلی پکڑی اور ایک زمانہ تک چھپ چھپ کے یونہی شکار کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے سزا دینے میں جلدی نہیں کی۔ پھر جب وہ کھلے بند شکار کر لے لگے۔ در بازاروں میں بچنے بھی لگے تو بعض لوگ جو ان میں متقی اور نیک تھے انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، انہوں نے ان شکار یوں کو اس طرح شکار کرنے سے منع کیا۔ انھیں بنی اسرائیل میں ایک تیسری جماعت تھی جس نے اگرچہ اس طرح شکار کی ہوئی مچھلی نہیں کھائی تھی لیکن ان شکار یوں کو روکتی بھی نہیں تھی، بلکہ جو لوگ روکتے تھے ان سے یہ کہتے کہ میاں، ایسے لوگوں کو وعظ و نصیحت سے کیا فائدہ جنھیں اللہ تعالیٰ ہلاک کرے گا اور انھیں شدید عذاب دے گا۔ دوسری جماعت کہتی کہ اس طرح ہم گویا اپنے رب کے حضور میں معذرت کرتے ہیں کہ ہمیں ہم بھی ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی لپیٹ میں

آجائیں اور یہ بھی امید ہے کہ یہی متقی بن جائیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اس عرصہ میں ایک دن بنی اسرائیل کے جو متقی اور پرہیزگار لوگ تھے وہ اپنی مجلسوں اور مسجدوں میں صبح کے وقت پہنچے تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نظر نہ آیا، انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی حادثہ پیش آیا ہے، چل کے دیکھنا چاہیے کہ کیا بات ہوئی چنانچہ یہ دیکھنے کے لئے ان کے گھروں پر گئے تو تمام دروازے بند تھے۔ وہ لوگ رات میں اپنے گھروں میں گئے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا، جیسا کہ عام طور سے ہر شخص کرتا ہے لیکن صبح کے وقت وہ سب بند رہنے چکے تھے، مرد اپنے کو جانتے پہنچاتے تھے لیکن بندر کی شکل اختیار کئے ہوئے تھے، یہی حال عورتوں اور بچوں کا بھی تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو نجات دیتا ہے جو گناہ سے لوگوں کو روکتے ہیں تو سب کو ہلاک کر دیتا کہتے ہیں کہ یہی وہ بستی ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ "وَأَسْأَلُكُمْ عَنِ الْقَدِيَةِ الْغَنِيِّ كَأَنَّكَ كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ" اور آپ ان سے اس بستی والوں کی بابت دریافت کیجئے جو سمندر کے کنارے پر تھی)

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مچھلی کے شکار کے سلسلے میں بنی اسرائیل کی اس بستی والوں کے تین فرقے ہو گئے تھے، ایک تو وہ جنہوں نے خود بھی شکار نہیں کیا اور شکاریوں کو منع بھی کیا۔ دوسرے وہ جنہوں نے صرف اپنا دام شکار سے بچائے رکھا لیکن شکاریوں کو منع نہیں کیا (تیسرا طبقہ وہ تھا جس نے اللہ کی حرمت کو توڑا اور نافرمانی اور سرکشی پر حجاز جب وہ نافرمانی سے کسی طرح باز نہیں آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ذلیل بند رہو جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ وہ سب بند رہ بن گئے۔ بندروں کی طرح ان کے پونچھ تھی اور انہیں کی طرح وہ اچھل کود رہے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اچھے خاندانوں اور عورتیں تھیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ آیت کا واقعہ ایہ کہ یہودیوں کا ہے، یہودیوں کی یہ بستی دریا کے ساحل پر واقع تھی۔ قرآن مجید کی آیت "اور ان سے اس بستی والوں کے متعلق دریافت کیجئے جو سمندر کے کنارے پر تھی" انہیں کے بارے میں ہے۔ آپ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے نافرمانوں نے شکار کی ترکیب یہ نکالی تھی کہ سینچر کے دن لب دریا ایک گڑھا کھود لیتے تھے اور ایک نالے کے ذریعہ اس گڑھے کو دریا سے ملا دیتے تھے جب کوئی لہر آتی تو اس نالے کے ذریعہ مچھلیاں اس گڑھے میں چلی آتیں، لیکن چونکہ پانی اس میں کم ہوتا تھا اس لئے اس سے نکل نہیں پاتی تھیں۔ اور اس طرح اتوار کے دن وہ ان مچھلیوں کو کپڑے گھر لے جاتے تھے پہلے ایک شخص نے یہ ترکیب نکالی۔ پھر اس کے پڑوسی کو معلوم ہوا اور پھر اسی طرح بہت سے لوگوں کو معلوم ہو گیا جو لوگ مومن اور متقی تھے انہوں نے پہلے تو منع کیا لیکن جب وہ باز نہ آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے ساتھ ایک بستی میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ اس بستی کے دو حصے کر دیئے اور بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ ایک حصہ میں مومن رہتے تھے اور دوسرے میں نافرمان اور سرکش۔ پھر مسلمانوں نے اپنی دیوار میں ایک دروازہ کھول دیا اور ان نافرمانوں نے بھی ایک دروازہ کھول لیا۔ داؤد علیہ السلام نے بھی ان پر لعنت کی۔ مسلمان اپنے دروازے سے نکل کر دوسری طرف جا با کرتے تھے۔ اور نافرمان دوسری طرف بھی مسلمانوں کی طرف آیا کرتے تھے۔ ایک دن مسلمانوں میں سے تو بہت سے افراد ان کی طرف گئے لیکن انہوں نے اپنی طرف کا دروازہ ہی نہیں کھولا، جب بہت دیر ہو گئی تو کچھ مسلمان دیوار پر چڑھے اور دیکھا کہ سب بند رہ بن گئے ہیں اور ایک دوسرے پر اچھل کود رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا مَوَّاعِنَهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدًا خَاسِئِينَ" پھر جب وہ اس چیز کی حد سے نکل گئے جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل بند رہو جاؤ اور "فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى بْنِ مَرْيَمَ" (بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان پر لعنت ہوئی داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے) میں انہیں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی جنہیں بند رہ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صورت ان کی مسخ نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے جیسے ایک دوسرے موقع پر "وَيَكْفُرُ بِآيَاتِنَا وَيَكْفُرُ بِآيَاتِنَا" کی گئی تھی بلکہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے جیسے ایک دوسرے موقع پر "وَيَكْفُرُ بِآيَاتِنَا وَيَكْفُرُ بِآيَاتِنَا"

ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابیں لادے ہو، کی مثال بیان کی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کے دل مسخ کر دیئے گئے تھے، واقعی بندہ کی صورت میں انھیں نہیں کیا گیا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جسے آیت واضح اور صاف طور پر بتاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ”اللہ نے انہیں سے بندہ، سور اور باطل کے پوجنے والے بنا دیئے“ دوسرے موقع پر اسی طرح اپنے نبی سے ان کے اس مطالبہ کو صاف طریقے پر اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ ”اِنَّ اللّٰهَ جَرُّوۡنَا“ (ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دیئے) اور یہ کہ جب انہوں نے یہ گستاخانہ سوال کیا تو انھیں سخت کڑک نے آلیا، ایک موقع پر ان کی گو سالہ پرستی کا ذکر صاف لفظوں میں ہے اور اس کے بعد، کہ اس گناہ سے ان کی توبہ یہ مقرر کی گئی کہ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو قتل کریں، ان کے متعلق اس کا بھی ذکر قرآن مجید میں ہے کہ سر زمین مقدس میں انھیں داخلہ کا حکم ہوا تو اپنے نبی سے انہوں نے کہا کہ آپ اور آپ کا رب جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے انھیں میدان تیبہ میں مبتلا کیا۔ زیر تفسیر آیت میں بھی جو انھیں نافرمانی اور عناد کی سزا دی گئی تھی وہ صاف طور پر بیان کر دی گئی۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ان کی صورت مسخ کر کے بندہ جیسی نہیں بنائی گئی تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے متعلق فرمادیا ہے کہ ان میں سے بندہ اور سور بنائے گئے تھے۔ تو اس کا یہ قول ایسا ہی ہوا جیسے کوئی شخص ان تمام آیات کی تاویل کرنے لگے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے نذاب اور اپنی سزاؤں کا ذکر کیا ہے اور کہنے لگے کہ واقعہ یہ سزاؤں مراد نہیں ہیں بلکہ تمثیل کے طور پر ان کا ذکر ہوا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل بیان کرے، کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ قرآن کے ظاہر اور واضح مفہوم کے خلاف ہے۔ اب اگر وہ کوئی دلیل بیان کرتا ہے تو اسے پرکھا جائے گا کہ وہ اس درجہ اور مرتبہ کی ہے بھی یا نہیں جس سے قرآن کے ظاہری مفہوم میں تاویل کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ان تمام ثقہ علماء کے قول کے خلاف ہے جن کا کسی غلط بات پر اتفاق نہیں ہو سکتا اور یہی اس قول کے فساد کے لئے کافی ہے۔

وَقَفَلْنَا لَهُمُ كُونًا قَرْدًا خَاسِئِينَ“ (پس ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندہ ہو جاؤ) یعنی ہم نے ان لوگوں سے کہا جنہوں نے عذابِ سینچر کے دن کے معاملہ میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ ”سبت“ کا اصل مفہوم راحت و خوش حال زندگی کا سکون و اطمینان ہے اسی لئے سونے والے کو ”سبت“ کہتے ہیں کیونکہ نیند کے عالم میں اس کا جسم پوری طرح آرام و راحت میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے ”وَجَعَلْنَا لَكُمْ سُبَاتًا“ یعنی ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے جسم کے لئے راحت و سکون کا باعث بنا لیا۔ سبت فلان ایسبت سے یہ مصدر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ سینچر (سبت) سے ایک دن پہلے جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو پیدا کر کے فارغ ہوا تھا، اس لئے جمعہ کے بعد والے دن (سینچر) کا نام ”سبت“ پڑا۔ ”کونوا قردا خاسین“ میں کونوا، صیغہ جمع کے معنی میں ہے (ہو جاؤ) ”خاسی“ جس کی جمع خاسین ہے) راندہ درگاہ، رحمت سے دور کو کہتے ہیں یہ لفظ کتے کو دھتکارنے کیلئے بھی استعمال کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ”ہو جاؤ بندہ، خمیر و رحمت سے دور اور ذلیل و حقیر“۔ مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ نے خاسین کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے اور یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

”وَجَعَلْنَا هَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا“ (پھر ہم نے اسے موجب عبرت بنا دیا اس زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کیلئے) مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ ”فجعلنا ہا“ میں ”ہا“ کی ضمیر سے کیا مراد ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”ہا“ کی ضمیر سے مراد ”عقوبت“ (سزا، عذاب) ہے یعنی ہم نے مسخ کی اس عقوبت (سزا) کو باعث عبرت بنا دیا، گویا ”فجعلنا ہا“ میں ”ہا“ کی ضمیر مسخ کی طرف لٹتی ہے، اس تفسیر کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندہ ہو جاؤ، چنانچہ مسخ ہو کر وہ بندہ ہو گئے اور اپنی اس سزا یعنی ان کے مسخ کو ہم نے اس زمانہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے لوگوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا، اور خوفِ خوف خدا رکھنے والوں کے لئے موجب نصیحت بنا دیا۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ منقول ہے کہ ”ہا“ کی ضمیر ”حیثنا“ (پھیلنے والوں کی طرف لٹتی ہے) اگرچہ پھیلنے والوں کا ذکر آیت میں صراحت کے ساتھ نہیں ہے، لیکن چونکہ

واقف میں اس کی طرف دلالت ہے یعنی "لقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت" میں اس لئے اسے مقدر مانا جاسکتا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ "ہا" کی ضمیر "قریۃ" (بستی) کی طرف لوٹتی ہے جس کے باشندوں نے سینچر کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ ایک اور قول یہ ہے کہ ضمیر "قرودۃ" (بندر) کی طرف لوٹتی ہے جو پہلے انسان تھے اور اب مسح کر کے بندر بنا دیئے گئے تھے، ایک قول یہ ہے کہ "امتہ" کی طرف ضمیر لوٹائی جائے یعنی وہ امت (جماعت) جس نے سینچر کے بارے میں حد سے تجاوز کیا تھا۔ "نکال" مقدر ہے، اس کا اصل معنی عقوبت اور سزا ہے۔ عدی بن ثابت عبادی نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔

"ما بین یدیہا وما خلفہا" کی تفسیر کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال ہیں ضحاک رحمۃ اللہ علیہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں: "تاکہ وہ لوگ میری سزا سے عبرت حاصل کریں جو ان کے بعد آئیں گے اور وہ لوگ بھی جنہیں وہ چھوڑ کے مسخ ہوئے یعنی جو ان کی قوم کے باقی بچ گئے تھے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ دوسرا قول خود ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے ان کے مولا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے یہ ہے کہ "ما بین یدیہا وما خلفہا" سے مراد بستی والوں میں سے ہی ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ما بین یدیہا" سے مراد ان کے گناہ ہیں اور "ما خلفہا" سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو انہوں نے پکڑی تھیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ما خلفہا" سے مراد ان کے وہ گناہ ہیں جن کی پاداش میں وہ ہلاک ہو گئے اور "ما بین یدیہا" سے مراد وہ گناہ ہیں جو پہلے انہوں نے کئے تھے۔ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "ما بین یدیہا" سے مراد ان کے وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کئے تھے، اور "ما خلفہا" سے مراد ان کے بعد آنے والی امتیں ہیں کہ اگر وہ بھی اسی طرح نافرمانی کریں گی تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرے گا۔ ایک قول اس سلسلے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ "فجعلنا ہا نکالنا بین یدیہا وما خلفہا" کا مطلب یہ ہے کہ مچھلیوں کو ہم نے ان کے اگلے پچھلے اعمال کا عذاب بنا دیا، یعنی جو اعمال وہ مچھلیوں کے واقعہ کے زمانہ میں کرتے تھے اور جو اس سے پہلے کرتے تھے اس کی سزا مچھلیوں کے ذریعہ ان کی آزمائش اور پھر اس پر عذاب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

ان تمام تفسیروں میں سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو ہم نے سب سے پہلے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی نقل کی ہے ہم نے پہلے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ "فجعلنا ہا نکالنا" میں "ہا" کی ضمیر سے مراد عقوبت اور مسخ مراد لینا دوسری تمام تفسیروں سے بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آیت میں اپنی مخلوق کو اپنی سطوت اور اپنے دیدہ بے ڈر لیا لے اور یہ مفہوم زیادہ واضح عقوبت و مسخ مراد لینے ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بعد "ما بین یدیہا وما خلفہا" کی ضمیر "ہا" سے بھی مراد لینا زیادہ بہتر ہو گا اور ضمیر "ہا" سے عقوبت و مسخ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کی بنیاد پر ہی مراد لینا ممکن ہے اب آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جب انہوں نے حد سے تجاوز کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ، اور پھر ان پر اپنی عقوبت اور عذاب کو جو ان کے لگے پچھلے گناہوں کی سزا تھی دوسرے ایسے لوگوں کے لئے باعث عبرت بنا دیا جو ان کے بعد انہیں جیسے اعمال کریں گے انہیں بھی ویسی ہی سزا دی جاسکتی ہے اور انہیں بھی مسخ کیا جاسکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تنبیہ ہے کہ اس طرح کے اعمال نہ کریں جیسے کہ ان لوگوں نے کئے تھے جنہیں مسخ کر دیا گیا، کہیں ان پر بھی وہی عذاب نہ نازل ہو جائے جن مفسرین نے "فجعلنا ہا" کی ضمیر "حیتان" (مچھلیوں) کی طرف لوٹائی ہے وہ آیت کے مفہوم اور عربی قواعد کے اعتبار سے بہت بعید ہے، کیونکہ ان کا تو آیت میں کوئی تذکرہ ہی سب سے نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلے میں کوئی حدیث منقول نہیں ہے اور آیت کے ظاہر کے بھی خلاف ہے، اس لئے "حیتان" کی طرف ضمیر لوٹانا مناسب نہ ہو گا۔ جن لوگوں نے اس کی ضمیر "قریۃ" کی طرف لوٹائی ہے۔ انہوں نے بھی یہی غلطی کی ہے۔

خوف خدا رکھنے والوں کی نصیحت
 "وموعظة للمتقين" (اور موجب نصیحت بنا دیا خوف خدا رکھنے والوں کے لئے)
 "وموعظة" مصدر ہے، بولنے میں "وَعظمت الرجل" میں نے اس شخص کو نصیحت

کی آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ "اس واقعہ کو ہم نے متقیوں کے لئے تذکرہ اور نصیحت بنا دیا کہ اس سے نصیحت و موعظت حاصل کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ "للمتقین" یعنی خوف خدا رکھنے والے اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے فرائض کی ادائیگی اور اس کی نافرمانی سے بچنے میں اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "وموعظۃ للمتقین" یعنی مومنین جو شرک سے بچتے ہیں اور میری طاعت و عبادت کرتے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے دن کے معاملہ میں حد سے تجاوز کرنے والوں کے واقعہ کو خاص مومنین اور متقین کے لئے موجب نصیحت و موعظت بنا دیا ہے اور کافروں، منکروں کے لئے باعث عبرت بنا دیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ واقعہ قیامت تک کے مومنین کے لئے باعث موعظت و نصیحت ہے ابن جریج ریح اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ ان کے بعد میں آنے والے متقیوں کے لئے باعث موعظت و نصیحت ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ مراد امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے کہ ان کے لئے موجب موعظت و نصیحت ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقْرًا ۗ قَالُوا أَتَتَّخِذُ الْبَقْرَ وَ

اور وہ زمانہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کر دو۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخر بناتے ہیں۔ موسیٰ

قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۗ قَالُوا اذْءُ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ ۗ

علیہ السلام نے فرمایا توذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ تو راست کہتے ہیں۔ ہم بیان کریں کہ اس بیل کے کیا وصف ہیں آپ نے

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ ۖ لَا تُحَمِّلُ وَلًا لَّيْسَ لَهَا كِتَابٌ وَلَا فِئْتَانٌ يَدْعُونَ بِهَا ۚ وَإِنَّهَا لَأَبْهَرَةٌ ۚ

فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچ ہو بلکہ اچھا ہو دو لوں عمر کے درمیان میں ابھی زیادہ محنت کئے بغیر بلا کر ڈالو جو کچھ کھو

قَالُوا اذْءُ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا لَوْ هَآءُ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ ۖ صَفْرَاءُ ۖ فَاقْرَأْ

تایا، کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) اور فرماست کہ جو بیل کے لئے تو یہ ہے اچھی یہ بیل کہیں اس کا رنگ کیا ہوا ہے تو فرمایا کہ (ایک متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل جس کا رنگ تیز ہو

لَوْ هَآءُ سَمِ الْبَظْرَيْنِ ۗ قَالُوا اذْءُ لَنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ ۗ إِنَّ الْبَقْرَ تَشْبَهُ فَلْيَنَآ

ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے کہ (میری خاطر اپنے رب دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کریں کہ اس کے اوصاف کیا ہیں) اور بیل میں (قدرے) اشتہا ہے۔

سے صاحب روح المعانی نے اس آیت کے ذیل میں ایک عارف بختہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عبادتوں کو خاص خاص ہئیت کے ساتھ متعین کیا ہے اور ان کے لئے اوقات بھی مخصوص رکھے ہیں تاکہ طبعی ظلمتیں دور ہوں، پس جو شخص شریعت کی متعین کردہ ان ہئیتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نور استعداد منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اصحاب سبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس امت کے لئے صورت اور ظاہر کا مسخ نہیں ہے، اس لئے جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہوئے ہیں اسی کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ پس ہر شخص کو چاہیے کہ شریعت کی متعین کردہ ہئیت کی پوری طرح رعایت کرے تاکہ اس کی انسانیت محفوظ رہ سکے۔ ہر زمانہ میں بعض اہل کشف ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو انسان کو اسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کی صفت حیوانی اس پر غالب ہوتی ہے۔ مثلاً جس پر ظلم و شقاوت غالب ہوتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی پکاراٹھتے ہیں کہ یہ بھیڑیا ہے۔ وعلیٰ هذا القیاس۔

(مترجم)

وَإِنَّا نَشَاءُ اللَّهُ لَمُنْتَدُونَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقْرَةٌ ۖ لَوْ رَدُّوهُ إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ

اور ہم ضرور انتظار اللہ تعالیٰ کی ایک بار اٹھیک بچ جاویں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ توہل میں چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جائے نہ اس سے زراعت کی

وَأَسْقَىٰ الْخَرْبَ مِثْلَ مَسْئَلَةٍ ۖ لَآ تَشِيءُ فِيهَا ۖ قَالُوا النَّبِيُّ جُنتٌ بِالْحَقِّ ۖ فَذَبَحْنَهَا

آبید پاشی کی جادے و غرض ہر قسم کے عیب سے سالم ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو یہ کہنے لگے کہ رہاں اب آپ کی پوری اوصاف بات فرمائی دیکھ اسکو ذبح کیا اور انکی جنتوں

وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۚ

سے ظاہر کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے۔

گائے ذبح کرنے کا حکم

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقْرَةً ۖ قَالُوا أَتَتَّخِذُ نَاهِنًا ۖ

بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم کے زمانہ کی یہودیوں کو اس بنا پر تنبیہ کی ہے کہ ان کے اسلاف نے بھی وہ عہد و میثاق توڑا تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کی پیروی کے سلسلے میں ان سے لیا تھا۔ ارشاد ہے، میرے ایک اور عہد کا توڑنا یاد کرو جو چپ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم، بنی اسرائیل، سے کہا کہ جو شخص تم میں سے قتل کیا گیا ہے اس کے سلسلے میں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو تو انہوں نے کہا، کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں؟ کھیل اور ہنسی کے معنی میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر و نہی کی جو خبر امتوں کو دیتے ہیں اس میں ہنسی یا کھیل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بنی اسرائیل کو یہی خیال ہوا کہ مقتول کے بارے میں ان کے جگڑے کو رفع کرنے کے لئے آپ گائے ذبح کرنے کا جو حکم دے رہے ہیں وہ محض مذاق ہے "اتخذناھن و" میں "فا" حذف ہے، یہ جملہ "ان اللہ یأمرکم الخ" کے جواب میں واقع ہوا ہے۔ ایسے موقع پر "فا" کا نہ ذکر کرنا ہی بہتر سمجھا جاتا ہے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا جواب نقل فرمایا کہ "قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاهلین" خدا مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں (یعنی ہنسی اور مذاق کی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے والا وہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی عظمت و کبریائی اور اس کی ذات و صفات سے ناواقف ہو۔ میں اس سے بے خبری ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم جو دیا تھا اس کی وجہ علیحدہ رحمتہ اللہ سے یہ منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بے اولاد شخص تھا۔ اس کے رشتہ دار نے اسے قتل کر دیا پھر اسے اٹھا کر اپنے قبیلہ سے دو ایک دوسرے قبیلہ میں لے جا کے ڈال آیا۔ اس پر ان میں آپس میں بڑا شدید نزاع و اختلاف پیدا ہو گیا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ فریقین نے ہتھیار اٹھائے۔ جو لوگ دانشمند تھے انہوں نے روکا اور کہا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے یہاں موجود ہیں اور اس کے باوجود تم لوگ آپس میں لڑائی کرتے ہو۔ چنانچہ سب اللہ کے نبی (موسیٰ علیہ السلام) آپس آئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ گائے ذبح کرو تو وہ بولے، کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔ وہ بولے کہ آپ اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بن بیانی، اللہ تعالیٰ کے ارشاد "پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے تک بیان کیا کہ پھر انہوں نے مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارا تو اس نے اپنے قاتل کے متعلق خود ہی بتا دیا۔ بیان کیا کہ جن اوصاف کی گائے مطلوب تھی اس کی قیمت میں اسی گائے کے برابر سونا دینا پڑا۔ بیان کیا کہ (اگر وہ پہلے حیل و حجت نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کے ابتدائی حکم پر معمولی گائے بھی خرید لیتے تو کافی ہوتی۔ آخر قاتل جو مقتول کا رشتہ دار تھا) اس کے مال کا وارث نہ ہو سکا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا، ساتھ ہی لا ولد بھی تھا البتہ اس کا ایک رشتہ دار تھا جو مرنے کے بعد اس کا وارث بنتا۔ اس نے وراثت کی لالچ

میں اسے قتل کر دیا اور ایک عام گزر گاہ پر لاش کو ڈال آیا۔ لاش کے قریب موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو اس سے آواز آئی کہ میرے رشتہ دار نے مجھے قتل کر دیا ہے، اور اے اللہ کے نبی! آپ کے سوا کوئی ایسا نہیں جو اس قتل کے راز کو کھول سکے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر کسی کے پاس بھی اس سلسلے میں کوئی علم ہو تو وہ ہمارے سامنے آئے۔ لیکن اس راز سے کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے بعد قاتل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں ہماری طرف سے اللہ سے درخواست کیجئے کہ میں اس سلسلے میں بتائے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی بھیجی کہ "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو"۔ انہیں اس پر بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے کیا آپ ہم سے ہنسی کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، مجھے اللہ اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ وہ بولے کہ پھر ہمارے لئے اپنے رب سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیانی۔ بلکہ دونوں عمروں کے درمیان میں ہو۔ وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو۔ دیکھنے والوں کو خوب بھلی معلوم ہوتی ہو۔ وہ بولے اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ اور کیسی ہو، اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔ کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے سخت کرنے والی نہ ہو کہ جسے سخت نے جھکا دیا ہو، جو زمین کو نہ جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ اس پر کوئی داغ و صبر نہ ہو۔ وہ بولے کہ اب آپ ٹھیک پتہ لائے، پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ بیان کیا کہ جب انھیں ابتدا میں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی وقت بلا حیل و حجت کے کوئی بھی گائے لائے اور اسے ذبح کرتے تو مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر سختی کرنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے بھی گائے کے سلسلے میں سخت قیدی لگا دیں۔ اور اگر انہوں نے آخر میں اپنی راہ یابی کو اللہ کی مشیت پر محمول نہ کر دیا ہوتا کہ "اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راستہ پا جائیں گے" تو انھیں کبھی راستہ نہ ملتا۔ ہمیں اس سلسلے میں روایت پہنچی ہے کہ ان تمام اوصاف کے ساتھ متصف گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس مل سکی جس کی پرورش میں بہت سے یتیم بچے تھے اور وہی گائے ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ جب بڑھیا کو معلوم ہوا کہ اس گائے کے سوا اور کوئی گائے وہ ذبح نہیں کر سکتے تو اس نے قیمت بہت بڑھادی۔ یہودی موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان اوصاف والی گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس ملتی ہے، لیکن وہ اس کی قیمت اصل سے کئی گنا زیادہ مانگ رہی ہے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تو پہلے تم پر کوئی بار نہیں ڈالا تھا، لیکن تم نے خود ہی یہ قیدی لگائی ہیں اب مالک کے حسب منشا قیمت دو۔ چنانچہ اتنی ہی قیمت دیکر گائے کو خرید لائے اور اسے ذبح کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ گائے کی ایک ہڈی لیکر مقتول کے جسم پر اسے ماریں۔ انہوں نے جب ایسا کیا تو مقتول کی روح لوٹ آئی اور اُس نے سب کے سامنے قاتل کا نام بتایا اور اس کے بعد پھر مر گیا۔ بنی اسرائیل نے قاتل کو پکڑ لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی سب سے پہلے اطلاع دی تھی۔ (تاکہ اس پر شبہ نہ ہو) لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اس بدترین عمل پر اسے ہلاک کیا۔

— سدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ مقتول کی ایک لڑکی تھی اور اس کے ایک بھتیجے نے جو غریب و نادار تھا اس لڑکی سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ لیکن باپ نے جو بہت مالدار تھا انکار کر دیا۔ لڑکے کو اس پر بڑا غصہ آیا اور اُس نے قسم کھائی کہ واللہ میں اپنے چچا کو قتل کر کے رہوں گا۔ اس کا سارا مال لے لوں گا۔ اس کی لڑکی سے نکاح کروں گا اور اس کی دیت بھی خود ہی وصول کروں گا۔ نوجوان اس عہد کے پورا کرنے کے لئے چچا کے پاس آیا۔ اس وقت کچھ تجارتی قافلے بنی اسرائیل کے بعض قبیلوں میں آئے ہوئے تھے۔ اُس نے کہا چچا میرے ساتھ آپ چلے چلئے۔ اور ان تاجروں سے کچھ سامان مجھے بھی دلوادیں۔ ممکن ہے مجھے اس میں کچھ نفع حاصل ہو جائے، یہ لوگ آپ کو دیکھیں گے تو مجھے سامان دیدیں گے۔ اس طرح نوجوان اپنے بوڑھے چچا کو رات کے وقت لیکر نکلا اور جب اس قبیلہ کے قریب پہنچا تو اُسے قتل کر ڈالا اور اپنے گھر واپس آ گیا۔ صبح ہوتے ہی خود اپنے چچا کو تلاش کرنے لگا (تاکہ اسپر کوئی شبہ نہ کرے) جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے

اس کے گھر معلوم کرنے کے بعد وہ اس قبیلہ کی طرف گیا جہاں اب اس کا چا مردہ پڑا تھا۔ وہاں تمام لوگ لاش کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس نے پہنچتے ہی ان پر الزام تراشی شروع کر دی کہ تمہیں لوگوں نے میرے چچا کو قتل کیا ہے۔ اب تمہیں اس کی دیت دینی پڑے گی۔ وہ رونے پھینے اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ (قاعدہ کے مطابق) اسکی دیت تمہیں دینی پڑے گی۔ کیونکہ مقتول تمہارے حملہ میں پایا گیا ہے اور قاتل کا کوئی پتہ نہیں، انہوں نے عرض کی، یا رسول اللہ! آپ اللہ سے دعا کیجئے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا واقعی قاتل کون ہے، خدا گواہ ہے کہ اس کی دیت (جو مال کی صورت میں ہمیں دینی پڑے گی) ہماری ادا کی جائے گی ہمارے لئے کوئی دشوار نہیں، لیکن ہمیں شرم آتی ہے کہ اس معاملہ پر ہمارے قبیلہ کو غیرت دلائی جا یا کرے گی۔ ان کے اس مطالبہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے کہ ”اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا، پھر تم آپس میں اس بات پر جھگڑنے لگے اور اللہ کو وہ ظاہر کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے“ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا ”تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو“۔ بنی اسرائیل بولے کہ ہم تو آپ سے مقتول کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور یہ کہ اسے کسے قتل کیا ہے اور آپ ہمیں حکم دے رہے ہیں کہ گائے ذبح کرو۔ آپ ہمارا مذاق تو نہیں بنا رہے۔“ قال اعوذ باللہ ان اکون من الجملین“ موسیٰ نے کہا خدا مجھے اس پتہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اس حکم کے بعد بنی اسرائیل کوئی بھی گائے لیتے اور اسے ذبح کرتے تو مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن انہوں نے خود جب قبیلے لگائی شروع کر دیں اور موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ ادھر بنی اسرائیل ہی کا ایک شخص اپنے والد کا نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار تھا۔ ایک موقع پر کوئی شخص موتی بیچتا ہوا ادھر سے گذرا۔ اس وقت اس کے والد سوار تھے اور خستہ آنے کی گئی ان کے سر کے نیچے تھی۔ تاجر نے اس شخص سے کہا کہ یہ موتی مجھ سے ستر ہزار میں خرید لو۔ نوجوان نے کہا کہ ٹھیک ہے لیکن میرے والد جاگ جائیں تو ان سے کبھی لیکے تمہیں موتی کی قیمت دوں گا، اگر تم تھوڑی دیر کے لئے صبر کرو تو میں ستر ہزار کے بجائے اسی ہزار دے دوں گا۔ (تاجر کو بھی خلیہ تھی) اس نے کہا کہ اگر تم اپنے والد کو ابھی جگا لو تو میں ساٹھ ہزار میں تمہیں موتی دے سکتا ہوں۔ اس طرح تاجر اس کے والد کو فوراً جگانے پر اصرار کرتا رہا اور قیمت گھٹاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے موتی کی قیمت تیس ہزار کر دی۔ لڑکے کا اس پر اصرار تھا کہ جب میرے والد خود سے جاگ جائیں گے اسی وقت میں تم سے موتی لے سکتا ہوں۔ اس کے لئے اس نے قیمت اور بڑھادی۔ جب تاجر نے بہت اصرار کیا تو اس نے حتیٰ طور پر کہہ دیا کہ خدا کی قسم، میں اس وقت تک تمہارے موتی نہیں خرید سکتا جب تک میرے والد خود سے نہ جاگ جائیں۔ اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ دیا کہ جس طرح کی گائے اب بنی اسرائیل تلاش کر رہے تھے ویسی ہی گائے اس کے یہاں پیدا کر دی تھی۔ جب بنی اسرائیل تلاش کرتے ہوئے ادھر سے گذرے تو دیکھا کہ جس طرح کی گائے انھیں مطلوب ہے وہ اس کے یہاں موجود ہے۔ پہلے تو انہوں نے کہا کہ ایک دوسری گائے لے لو اور یہ گائے ہمیں دیدو۔ لیکن اس نے انکار کیا تو انہوں نے اس کی قیمت دو گنی لگائی پھر اس کے انکار پر دس تک پہنچے اور جب اتنی قیمت پر بھی وہ تیار نہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ گائے تو تمہاری بہر حال خریدنی ہے۔ چنانچہ وہ اس شخص کو لیکر موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! گائے اس کے پاس مل گئی ہے اور ہم نے قیمت بھی لگادی لیکن یہ دینے سے انکار کر رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی، انہیں گائے دیدو اس نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! میں اپنے مال کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔ آپ نے فرمایا، تم نے صحیح کہا اور بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اسے خوش کر کے گائے کو چنانچہ وہ اس گائے کے برابر سونا دینے پر تیار ہو گئے، لیکن وہ اس پر بھی راضی نہیں تھا۔ آخر جب انھوں نے گائے کے دس گنا وزن کے برابر سونا دیا تو اسے گائے بھی گائے ذبح ہوئی اور پھر قاتل کا پتہ مقتول نے خود ہی بتا دیا۔ عیاد، وہ بھیدین کب قرظی اور محمد بن قیس رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی اسی طرح کی روایتیں منقول ہیں۔ تھوڑا سا اختلاف بھی ہے، مثلاً بعض کہتے ہیں کہ قاتل مقتول کا بھائی تھا، بعض کے خیال میں بھتیجا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وارثوں کی ایک جماعت تھی جو مقتول کے مرنے کا انتظار

کرتی رہی، لیکن جب بہت دن ہو گئے تو اسے قتل کر ڈالا۔ ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اختصار کے ساتھ مذکورہ بالا روایتوں کے مطابق منقول،
گائے کیسی ہو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے محض موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے کے لئے کہا تھا کہ

ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں چائے کرگئے کیسی ہو؟ قالوا ادع لنا ربنا بديننا
 لئنا نأمنه "جب انہوں نے خود جہالت اور کٹھن حجتی کار اسنے اختیار کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سورظنی کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کا بھی حکم نازل
 ہوا۔ " قال انه يقول انما بقرة لا فادض ولا بکر عوان بين ذلك فافعلوا ما تؤمرون " کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو
 نہ بن بیانی، بلکہ دونوں عمر و نئے درمیان ہو " لا فادض " یعنی بوڑھی اور عمر رسیدہ نہ ہو۔ بولتے ہیں " فادض " یعنی گائے بوڑھی
 ہو گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ " فادض " بوڑھی اور عمر رسیدہ کے معنی میں ہے۔ مجاہد، ابوالعالیہ، ربیع قتادہ اور
 سدی رحمہم اللہ سے بھی یہی معنی اس لفظ کا نقل ہوا ہے۔ " ولا بکر " بکر جانوروں اور انسانوں کے اس مادہ جس کو کہتے ہیں جس کے قریب
 ابھی نہ گیا ہو۔ دوسرا لفظ اسی سے " بکر " بکے فتح کے ساتھ آتا ہے، نوجوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ آیت میں " ولا بکر " سے مراد یہ ہے کہ بالکل
 کم عمر نہ ہو کہ جس نے ابھی تک کچھ بھی نہ دیا ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے " بکر " کا معنی " کم عمر چھپا " ہی نقل ہوا ہے۔ مجاہد قتادہ، ابوالعالیہ
 اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے " بکر " کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ " جس نے ایک بچے سے زیادہ نہ دیا ہو۔ "
 " عوان " یعنی درمیان کی، جو ایک سے زیادہ مرتبہ بیاہلی ہو یہ " بکر " کی صفت نہیں ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ " وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیانی
 بلکہ ان دونوں کے درمیان میں ہو۔ " عوان " آیت میں مبتدای بن سکتا ہے، کیونکہ " بین ذالک " سے کنایہ " فادض ولا بکر " کی طرف
 ہے لہذا یہ ان پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ بولتے ہیں " بقرة عوان " اور " بقرة عوان " ایسی لڑائی جس میں ایک سے زیادہ مرتبہ قتل و قتل
 ہو چکا ہو اس کے لئے " حذب عوان " بولتے ہیں۔ اسی طرح ایسی عورت جو ایک سے زیادہ مرتبہ بچے دے چکی ہو اس کے لئے " امرا
 عوان " استعمال ہوتا ہے " حاجب عوان " ایسی ضرورت کو کہتے ہیں جو کئی بار پوری کی جا چکی ہو۔ چنانچہ یہی تفسیر مجاہد اور سدی رحمۃ
 اللہ علیہما سے منقول ہے کہ " وہ گائے ان دونوں عمروں کے درمیان ہو اور ایک دو مرتبہ بیانی ہو " ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابوالعالیہ
 ربیع، قتادہ اور ابن زبیر رحمہم اللہ کی روایات میں بھی یہی ہے کہ " دونوں عمروں کے درمیان ہو " " بین ذالک " یعنی بن بیانی اور بوڑھی
 کے درمیان ہو۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح تفسیر منقول ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ موسیٰ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے
 نہ بوڑھی ہو نہ بن بیانی، بلکہ اسے ان دونوں عمروں کے درمیان ہونا چاہیے یعنی بوڑھی اور نوجوان گائے کے درمیان عمر کی گتہ جس نے ایک
 سے زیادہ مرتبہ بچہ دیا ہو۔ " فافعلوا ما تؤمرون " پس اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے پس اگر تم نے وہی ہی گائے ذبح کر ڈالی جس کا میں
 نے تمہیں حکم دیا ہے تو تمہیں مقتول کے قاتل کے متعلق معلوم ہو جائے گا اور تم اپنے مقصد کو حاصل کر لو گے۔ x

بال کی کھال " قالوا ۱۱ ۶ لنا ما بدين لنا ما لو لنا قال انه يقول انما بقرة صفراء " (وہ بولے ہماری طرف سے
 اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے، کہا کہ وہ سرماتا ہے کہ گائے
 خوب گہرے زرد رنگ کی ہو) اب انہوں نے اس گائے کے رنگ کے متعلق سوال شروع کر دیا۔ یہ ان کی کج روی کی دوسری
 مثال ہے، پہلی ہی مرتبہ بلا کسی سوال کے اگر وہ کوئی بھی گائے ذبح کر لیتے تو مقصد برآری کے لئے کافی تھا۔ لیکن انہوں نے پہلے
 گائے کے حلیہ کے متعلق سوال کیا اور یہ کہ وہ کیسی ہونی چاہیے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی کج روی کی سزا کے طور پر ان کے لئے
 ایک خاص قسم کی گائے کا ذبح کرنا ضروری قرار دے دیا کہ اس کے سوا دوسری کسی قسم کی گائے وہ ذبح نہیں کر سکتے تھے۔
 پھر انہوں نے آگے بڑھ کے مزید عناد اور کج روی کا مظاہرہ کیا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض تکلیف پہنچانے کے لئے اس
 رنگ کے متعلق بھی سوال کر ڈالا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی اس کج روی کی سزا کے طور پر ان سے
 کہا گیا کہ " وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو، دیکھنے والوں کو ابھی معلوم ہوتی ہو " اب انہیں ایک خاص رنگ کی گائے کے

ذبح کا پابند کر دیا گیا، یعنی جس گائے کے ذبح کرنے کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے وہ خوب گہرے زرد رنگ کی ہونی چاہیے۔ ”صفراء“ (جس کا ہم نے ترجمہ زرد کیا ہے) کے مفہوم کے سلسلہ میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کا مفہوم ہے ”خوب گہرے کالے رنگ کی“۔ ایک دوسری روایت میں حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ مراد یہ ہے کہ ”اس گائے کی سیلنگ اور کھر زرد رنگ کی ہوں“۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن زید اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے مفہوم ”زرد رنگ کی“ ہی منقول ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن حضرات نے ”صفراء“ سے ”کالے رنگ کی گائے“ مراد لی ہے ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اہل عرب کالے اونٹ کے لئے، ”اہل صفراء“ اور کالی اونٹنی کیلئے ”فاقۃ صفراء“ استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ تھی کہ کالے اونٹ یا اونٹیاں ہمیشہ زردی مائل ہوا کرتی ہیں، اس لئے اونٹ میں تو یہ چل سکتا ہے، لیکن گائے جس کا رنگ اس طرح کا نہیں ہوتا، اس میں یہ صفت کس طرح چل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہے کہ عرب ”سواد“ (کالے) کی صفت کبھی ”فقوع“ (گہرا) نہیں لاتے، بلکہ اگر سواد (کالے رنگ) کی شدت اور گہرائی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو اس کی صفت ”حلوکۃ“ وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ ”اسود حالک“ (گہرا سیاہ رنگ) یا اسی مفہوم کے لئے ”اسود غریب“ اور ”اسود وجوحی“ بولتے ہیں۔ ”اسود فاقح“ کبھی نہیں کہتے۔ البتہ ”صفراء“ (زردی) کی صفت فاقح لاتے ہیں، بولتے ہیں ”اصفر فاقح“۔ اس سے واضح طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ ”صفراء“ آیت میں زرد رنگ کے لئے استعمال ہوا ہے، اس کا مفہوم سیاہ رنگ بنانا درست نہیں ہے۔ ”فاقح اونٹنا“ یعنی گہرا اور خاص زرد رنگ ہو۔ بیاض (سفیدی) میں اگر صفائی اور شدت کو بتانا مقصود ہوگا تو اس کے لئے ”نصوع“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اسی طرح صفر (زردی) کی شدت و صفائی کے لئے ”فقوع“ (جس سے فاقح بنا ہے) استعمال ہوتا ہے۔ قتادہ ابو العالیہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے کہ مراد یہ ہے کہ ”اس کا رنگ کھلا ہو، خالص زرد ہو“۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا کہ ”خوب گہرا زرد رنگ ہو، ایسا لگے جیسے ابھی سفیدی اس میں سے نکل آئے گی“۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا گہرا زرد رنگ ”تنیر الناظرین“ یعنی یہ گائے اپنے جسم اور ظاہر میں ایسی ہو کہ دیکھنے والے کو خوب اچھی لگے۔ قتادہ اور سدی رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یعنی دیکھنے میں ایسی لگے جیسے سورج کی شعاعیں اس کی جلد سے پھوٹ پڑیں گی۔

”قَالُوا ذُحِّ لَنَا رَبُّكَ بِسُنِّ لَنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقْرَ نَشَابَهُ عَلَيْنَا وَاِنَّا لَنَشَاءُ اللّٰهُمَّ مَثَلًا وَاَنْتَ“ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جنہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا (کہا کہ آپ اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے اور کیسی ہو؟ اس لئے کہ گائے میں ہیں اشتباہ پڑ گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے) یہ ان کی طرف سے تیسری مرتبہ جہالت کا مظاہرہ ہے۔ پہلے گائے کی عمر کے متعلق سوال کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر متعین کر دی۔ اگر اس پر بس کرتے اور اس عمر کی گائے تلاش کر کے ذبح کر دیتے تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے سرکشی سے کام لیا اور رنگ کے متعلق سوال کر بیٹھے اور اب یہ تیسرا سوال ہے۔ اور ان سوالات کے نتیجے میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پابندیوں پر پابندیاں عائد ہو رہی ہیں گائے کے ذبح کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اتنی سختی محض ان کے بار بار اس سلسلے میں سوال کرنے اور آپس میں اختلاف کرنے کی وجہ سے کی ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے ارشاد فرمایا ہے کہ ”جو کچھ میں تمہارے (عمل کے) لئے چھوڑ رہا ہوں اس سے زیادہ مجھ سے مت پوچھو، کہ تم سے پہلے کی امتیں اپنے نبی سے بار بار (غیر ضروری) سوال اور اپنے نبی کی موجودگی میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، پس میں جب کسی چیز کا تمہیں حکم دوں تو اسے بجا لاؤ اور جب کسی چیز سے روکوں تو بجا تامل رک جاؤ، جتنا بھی تم سے ہو سکے۔ نبی اسرائیل نے اپنے نبی موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سوال کر کے جتنی تکلیف پہنچائی ان پر اتنی سختی کر دی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر انہوں نے معمولی قسم کی گائے بھی ذبح کر دی ہوتی تو مقصد حاصل ہو جاتا، لیکن انہوں نے سختی کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ عبیدۃ السلمانی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما سے بھی یہی روایت ہے،

مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر انہوں نے اللہ کی مشیت پر حجت نہ کر دیا ہوتا اور یہ نہ کہا ہوتا کہ ”اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے“ تو انہیں کبھی راہ نہ ملتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ اس گائے کی کھال میں بھر کے دینار اس کی قیمت میں دینے پڑے تھے۔

مختلف اقوال جو صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے مفسرین کے ہم نے نقل کئے ہیں کہ نبی اسرائیل نے ابتداء ہی میں اللہ کے حکم پر کوئی بھی معمولی گائے ذبح کر دی ہوتی تو ان کی مقصد برآری کے لئے کافی ہوتی

اصول فقہ کا ایک مسئلہ

لیکن جب انہوں نے کھو دکر بید شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی، ان تمام اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور اپنی کتاب میں انہیں جو بھی حکم دیا تھا اور جس چیز سے بھی روکا تھا، ان سب کے متعلق نبی اسرائیل خوب جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان احکام کے ظاہر سے جس طرح کا عام حکم نکلتا ہے وہی اللہ تعالیٰ کا منشا ہے، اس ظاہری حکم کے سوا کوئی اور باطنی اور خاص حکم وہاں اللہ تعالیٰ نہیں دیتا چاہتا جس کا اس ظاہری عموم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس میں کس قسم کی تخصیص منظور ہوتی تو وہ خود اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کے ذریعہ اس کی وضاحت کر دیتا اور پھر کتاب اللہ یا رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اگر کوئی ایسا حکم، خاص کر دیا جاتا ہے جو اس سے پہلے کی آیت میں بظاہر عام معلوم ہوتا تھا تو صرف یہ خاص حکم ہی اس عموم سے الگ سمجھا جاتا ہے جس کا خصوص خود کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ کے ذریعہ معلوم ہوا تھا، اس کے بعد آیت جس طرح پہلے عام تھی، اس خاص حکم کے نکل جانے کے بعد اس کا عموم اب بھی باقی رہتا ہے اور اس خاص کے سوا کوئی اور چیز اس عموم سے اپنی طرف

سے کوئی شخص نہیں نکال سکتا۔ ہم نے اس فقہی عمل کی وضاحت اپنی کتاب ”کتاب الرسالۃ من لطیف القول فی البیان عن اصول الاحکام“ کے ”عموم وخصوص“ کی بحث میں کر دی ہے۔ ہم نے جو فقہی اصل ذکر کی ہے اس کی دلیل اس آیت سے متعلق ان مختلف اقوال سے ملتی ہے جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

کیونکہ ان اقوال سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ نبی اسرائیل کی سب سے بڑی غلطی اور نافرمانی یہ تھی کہ انہوں نے جان بوجھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جو حکم عموم کے ساتھ دیا تھا اس میں تخصیص کے لئے کھو دکر بید کرنے لگے۔ ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے سوال نہ کیا ہوتا اور جو حکم ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا تھا، اسی پر پوری فرمانبرداری اور طاعت کے ساتھ عمل کیا ہوتا تو کوئی بھی ایسا جائزہ ”گائے“ کہا جاسکتا ہو پھر ذبح کر سکتے تھے

اور اس سے ان کا مقصد حاصل ہو جاتا۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عام حکم کے باوجود سوال کیا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک اور قید بڑھا دی کہ ”وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیانی، بلکہ دونوں عمروں کے درمیان ہو“ اب ان کے لئے ضروری تھا کہ اس شرط کے مطابق کوئی ایسی گائے تلاش کرتے جو نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیانی، بلکہ دونوں عمروں کے درمیان عمر کی ہوتی

اگر انہوں نے اس شرط کے بعد اسی کے مطابق کوئی گائے تلاش کر کے ذبح کر دی ہوتی تو اس سے ان کا مقصد حاصل ہو جاتا، لیکن انہوں نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور سوال کر بیٹھے کہ اس کا رنگ کیسیا ہو؟

اللہ تعالیٰ نے مخصوص رنگ کی بھی پابندی لگا دی اور اب ان کے لئے ضروری ہو گیا کہ اسی خاص رنگ کی گائے ذبح کریں ان تمام اقوال میں جو ہم نے اس سلسلے میں بیان کیا کہیں یہ موجود نہیں ہے کہ ان کے ایک مرتبہ سوال کرنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے عام حکم کو چند شرائط کے ساتھ خاص کر دیا تھا تو وہ عام حکم بھی عام باقی نہیں رہا تھا، بلکہ خاص ہو گیا تھا۔ پس ان اقوال کا اس سلسلے میں اتفاق اور سب سے بڑھکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث جو ہم نے نقل کی ہے ان سب سے وہی اصل صاف طور

پر سمجھ میں آتی ہے جو ”عموم وخصوص“ کے باب میں ہم نے بیان کی کہ جب بھی کوئی حکم اللہ کی کتاب میں ”عموم“ کے ساتھ ذکر ہو گا تو اس سے عام حکم ہی مراد ہو گا۔ البتہ اگر کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ سے اس بظاہر عام حکم میں کوئی تخصیص سمجھ میں آئے تو عام حکم پھر بھی عام ہی رہتا ہے، البتہ اس سے عام حکم کی وہ چند صورتیں ضرور نکل جاتی ہیں جس کے بارے میں خود کتاب اللہ

یا سنت نے فیصلہ کر دیا ہے۔ بعض جاہلوں کا خیال ہے کہ گائے ذبح کرنے کا جب انھیں حکم ہوا تو نبی اسرائیل نے سمجھا کہ انھیں کسی خاص قسم کی گائے ذبح کرنا ضروری ہے اور اس لئے انہوں نے یہ سوالات کئے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے تنگی اور سختی نہ کرتا، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کوئی فرض حکم نازل کر دے اور اس کی عبادت کا حکم بھی دے، لیکن اس حکم کی کوئی وضاحت نہ کرے۔ یہ ایک خلاف واقعہ بات ہے اور وہی لوگ ایسی باتیں کر سکتے ہیں جو فہم و عقل سے بہت دور ہوں گے آیت میں ”الْبَقْرَةَ“ کی جمع ہے (یعنی گائے) بعض قرأتوں میں (ان البقر کے بجائے) ”ان البقر“ آیا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ بھی کلام عرب میں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن چونکہ مشہور و متداول قرأت کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قرأت جائز نہ ہوگی۔ ”تَشَابَهٌ عَلَيْنَا“ کا مطلب ہے ”ہمیں التباس و اشتباہ ہو گیا ہے“ اس کی بھی قرائتیں مختلف نقل ہوئی ہیں، اور میرے نزدیک صحیح مشہور و معروف قرأت ”تَشَابَهٌ“ شین کی تخفیف اور ہا کے زبر کے ساتھ ہے (کیونکہ تمام قابل اعتماد قرائتیں اسی کے مطابق نقل ہوئی ہیں۔ ”وَاِنَّا اَنْشَاَ اللّٰهُ لِمَهْتَدٍ وَّن“ یعنی گائے کے سلسلے میں جو التباس اور اشتباہ ہو گیا ہے، اگر اللہ نے چاہا تو وہ ہمارے لئے اس معاملہ کو واضح کر دے گا۔ ”اِذْ تَدْعُ“ کا مفہوم اس آیت میں واضح کرنا اور کھولنا ہے۔

تیسری شرط گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوڑتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو (مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے وہ محنت کرنے والی نہ ہو یعنی ایسی نہ ہو کہ کام نے اسے تھکا دیا ہو۔ اس طرح آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ایسی گائے ہو جس سے محنت جوتنے کا کام نہ لیا گیا ہو اور نہ اس سے کھیتی کو پانی دینے کا کام لیا گیا ہو۔ ایسے جانور کو جس سے سواری یا دوسرے کام خوب لئے جاتے ہوں۔ ”ذَابَّةٌ ذُوْلُ“ کہتے ہیں۔ ”رَجُلٌ ذُوْلٌ“ (معمولی کام کاج والا شخص) بھی اسی سے ہے۔ ”انما بقرة لا ذول“ کا مفہوم قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل ہوا ہے کہ وہ مضبوط ہوا کام کاج کرنے سے تھکا نہ دیا ہو، وہ نہ زمین جوڑتی ہو اور نہ کھیتی میں پانی دیتی ہو، ریح مجاہد، سدی اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صفات اس لئے بیان کیں کہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے وہ گائے وحشی اور چمکی قسم کی تھی۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے۔ ”مُسَلَّمَةٌ“ سلامت سے نکلا ہے یعنی محفوظ ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ داغ و بے سے محفوظ ہو، نہ اس پر سفید داغ ہوں اور نہ سیاہ۔

بعض دوسرے مفسرین نے فرمایا ہے کہ عیوب سے محفوظ رہنا مراد لیا گیا ہے۔ قتادہ، ابو العالیہ اور ریح رحمہم اللہ سے یہ روایت ہے کہ اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ اور یہی قول زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اگر ”مسلمۃ“ کا مطلب یہ ہوتا کہ داغ و بے سے محفوظ ہو تو پھر اس کے بعد فوراً ہی ”لا شئۃ فیہا“ نہ آتا کیونکہ اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ گائے ایسی ہو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو زمین کو جوڑتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دینے والی ہو اور اس کے ساتھ ان قرآن مجید کی مذکورہ بالا جس آیت سے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی اصل کا استنباط کیا ہے، قطعاً کسی طرح بھی یہ اصل اس آیت سے یا ان اقوال سے جو آیت کی تفسیر میں نقل ہوئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتی۔ نبی اسرائیل نے سرکشی اور نافرمانی کی اللہ کے رسول کو تکلیف دینی چاہی اور اس کی انھیں سزا ملی۔ یہ ہے آیت کا حاصل! عموم و خصوص کی بحث کا اس سے کیا تعلق! البتہ ضمناً اس آیت سے کوئی مسئلہ نکلتا ہو تو یہ دوسری بات ہے، فقہ کے اتنے اہم اصول کی بنیاد اس پر نہیں رکھی جاسکتی۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ کہا ہے وہ بہت غیر واضح ہے۔ یہ اصل ائمہ فقہ کے یہاں مختلف نہیں ہے۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ (مترجم)

۱۵ ہندوستان میں کھیت جوتنے اور پانی دینے کا کام صرف بیلوں سے لیا جاتا ہے، گائے سے نہیں لیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ممالک میں یہ کام گائے سے بھی لیا جاتا ہے (مترجم)

اس میں کوئی عیب بخیر نہ ہو۔ "لا شیتہ فیہا" یعنی اس کے چمڑے کے اصلی رنگ کے سوا اسپر کوئی اور دھبہ اور داغ نہ ہو۔ "وَرَشَى التَّوْبَىٰ" سے نکلا ہے کپڑے کو خوبصورت بنانے کے لئے مختلف رنگوں کے دھاگے بنتے وقت تانے بانے میں استعمال کرنے کیلئے بولتے ہیں۔ یا دشاہ یا کسی حاکم وغیرہ کے پاس اگر کوئی کسی کا سفارشی بن کر جائے اور اس کی خوب تعریفیں کرے تو اس کے لئے "وَرَشَى" کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی جھوٹ پھر طرح اسے اچھا اور قابل تعریف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عربی لغت کے بعض علماء کا خیال ہے کہ "وَرَشَى" علامت اور نشانی کے معنی میں آتا ہے اس کے "وَاو" کو حذف کر کے آخر میں "تا" بڑھا دی گئی ہے اور اس طرح "وَرَشَى" سے "وَرَشِيَّة" ہو گیا ہے عربی میں اس طرح تبدیلی اس وزن پر بکثرت ہوتی ہے۔ اس لفظ کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے وہی دوسرے اکابر مفسرین سے بھی منقول ہے۔ قتادہ ربیع اور ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے کہ "لَا شِيْئًا فِيْهَا" یعنی اس میں سفیدی نہ ہو، مجاہد اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ اس میں نہ سفیدی ہو نہ سیاہی عطیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اصلی رنگ کے سوا کوئی دوسرا رنگ اس میں نہ ہو۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہ اس میں سفیدی ہو نہ سیاہی اور نہ سرخی۔

دِقَاتُ الْاٰرَاٰنِ جَبَّتْ بِالْحَقِّ" اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بھی مختلف اقوال نقل ہوئے ہیں، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ بولے اب آپ نے حق بات صاف صاف بیان کی ہے" اور عبد الرحمن بن زید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قوم کی ذہنیت کی اطلاع دی ہے یعنی انہوں نے اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ گائے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو حکم دیا تھا وہ آپ صاف طریقے سے نہیں بیان کر رہے تھے، لیکن اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بات بتادی، ہمارے نزدیک دونوں میں زیادہ مناسب تفسیر وہ ہے جو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر مفسرین سے منقول ہے، یعنی یہ کہ انہوں نے کہا اب گائے کے سلسلے میں آپ نے حق بات صاف صاف بیان کر دی ہے اور اب ہم مجھ گئے کہ کس طرح کی گائے ہمیں ذبح کرنی چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ بتایا ہے کہ آخر میں انہوں نے گائے ذبح کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کا حکم، اس کے باوجود کہ پوری شرائط کے ساتھ اسے انجام دینا انتہائی دشوار ہو گیا تھا اور اس کی قیمت بھی انہیں بہت دینی پڑی تھی۔ لیکن بہر حال انہوں نے اسے تمام شرائط کے ساتھ انجام دیا تھا۔ چنانچہ اس آیت کے بعد ہے کہ "فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَاوُ وَا يَفْعَلُوْنَ" (پھر انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے معلوم نہیں ہوتے تھے) پس اگر "اَلَا تَنْبَغِيْ بِالْحَقِّ" (اب آپ نے حق بات صاف صاف بتادی) بھی انہوں نے محض ہنسی عناد اور جہالت کی وجہ سے کہا تھا تو یہ آیت کی ان تفصیلات کے خلاف ہو گا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ گائے کے سلسلے میں وہ سوالات کرتے رہے تھے اور موسیٰ علیہ السلام اس کے جوابات انہیں دیتے رہے تھے اور بالآخر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام ہی کے حکم کے مطابق گائے ذبح کی پس ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ان لوگوں نے "اَلَا تَنْبَغِيْ بِالْحَقِّ" کہہ کے اس کا اظہار کیا تھا کہ اب تک آپ حق کو چھپاتے رہے تھے اور یہ ان کا کفر اور اپنے دین سے ارتداد تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو اسکے فوراً ہی بعد اطلاع دی ہے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا حکم مان لیا اور گائے ذبح کی۔ "فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَاوُ وَا يَفْعَلُوْنَ" یعنی پھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اس گائے کو ذبح کیا جسے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی شرائط کے ساتھ ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ "وَمَا كَاوُ وَا يَفْعَلُوْنَ" یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذبح نہیں کریں گے اور اس سلسلے میں اللہ کے فرض کو چھوڑ دیں گے۔ مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ آخر کیوں وہ گائے کو ذبح کرتے نہیں معلوم ہوتے تھے؟ محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ کیوں کہ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی اس لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اللہ کے فرض کو چھوڑ دیں گے اور ذبح نہیں کریں گے، گائے والوں نے اس کے چمڑے میں بھر کر سونا اس کی قیمت کے طور پر مانگا تھا جو مقتول کے مال سے انہیں دینا ہوتا، لیکن آخر الامر انہوں نے ذبح کر ہی دیا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ رسوائی اور بدنامی کے خیال سے وہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے کہ جس مقتول کے قاتل کے بارے میں انہوں نے آپس میں جھگڑا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح اسے ضرور ظاہر کر دیا، ہمارے نزدیک دونوں ہی تفسیریں صحیح ہیں۔ قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے بھی وہ بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اس کا خوف دامن گیر تھا کہ اس طرح تو حقیقت حال بالکل کھل جائے گی اور قاتل کو سب جان

لیں گے۔

قیمت ایک گائے کی

اس کی غیر معمولی قیمت کے سلسلے میں کئی روایتیں ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گائے انہوں نے اس کے دس گنا وزن کے برابر سونے کے بدلہ میں خریدی تھی۔ عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی کھال میں دینار بھر کر اس کی قیمت کے طور پر انہیں دینا پڑا تھا۔ مجاہد اور ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ گائے انہیں ایک ایسے شخص کے پاس ملی جو اسے کسی قیمت پر بھی بیچنا نہیں چاہتا تھا، لیکن بنی اسرائیل خریدنے پر مسلسل اصرار کرتے رہے، آخر یہ طے پایا کہ کھال اتارنے کے بعد اس کی کھال میں دینار بھر کر اس کی قیمت کے طور پر دیں گے۔ اب وہ بچے پر تیار ہوا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان صفات کی گائے صرف ایک بڑھیا کے پاس مل سکی اور اس نے ان سے کئی گنا قیمت مانگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل سے کہا کہ اس کی مرضی کے مطابق قیمت دیکے خرید لو۔ آخر گائے خریدی گئی اور ذبح کی گئی۔ گائے کی اصل اور واقعی قیمت بہت کم تھی، چنانچہ حکم مد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی قیمت تین دینار سے زیادہ نہیں تھی۔ انہیں اس کا بھی خوف تھا کہ اگر انہوں نے گائے ذبح کر دی تو قاتل کا علم سب کو ہو جائے گا اور اس میں بڑی رسوائی ہوگی۔ وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہم سے منسی کر رہے ہیں؟ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر گائے ذبح ہوئی تو ان کی رسوائی ہوگی، اس لئے ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آخر میں جب اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا اور اس نے اپنے قاتل کے متعلق بتا دیا تو بنی اسرائیل کے وہ افراد جو قتل میں شریک تھے انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ خدا کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا ہے،

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَءُتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝

ذرا وہ زمانہ یاد کرو جب تم لوگوں میں سے کسی نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے کو اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے۔

فَقُلْنَا اضْرِبْهُ بِيَدِكَ بِبَعْضِ مَا كُنَّا نَعْلَمُ ۝

اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھو دو۔ اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دینگے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھائے گا۔

تَعْقُلُونَ ۝

ہیں اسی توقع پر کہ تم عقل سے کالیا کرو

اللہ کی قدرت کے مظاہر

جس کے قتل کے متعلق اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے اور جس کے متعلق آیت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ قاتل کا پتہ چلے "إِذَا رَأَيْتُمُ" یعنی اختلاف اور جھگڑا کیا۔ یہ ذرا سے نکلا ہے جس کا اصل معنی "لوٹنا" ہے۔ "إِذَا رَأَيْتُمُ" کا جو مفہیم ہم نے بیان کیا وہی معنی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں بھی مراد لئے گئے ہیں۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امیہ کے صاحبزادے عثمان اور زھیر رضی اللہ عنہما میرے پاس آئے اور رسول اللہ وسلم سے میرے لئے آپ کی خدمت میں حاضری کی اجازت چاہی۔ آنحضرت نے اس پر فرمایا کہ میں اسے تم لوگوں سے بھی زیادہ جانتا ہوں (اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا) کیا تم جاہلیت کے زمانہ میں میرے شریک نہیں تھے؟ میں نے عرض کی ہاں میرے ماں باپ آنحضرت پر فدا ہوں،

آنحضرتؐ کہتے ہیں "گنت لا تمأری ولا تدارعی" (نہ آپ نے کبھی کوئی جھگڑے کی بات کی اور نہ کبھی کوئی اختلاف کیا) "فاداء تم" اصل میں "فتداد تم" تھا، چونکہ "تا" اور "دا" کا مخرج قریب ہے۔ اس لئے تا کو بھی دال پڑھا جانے لگا، تاکہ ادائیگی میں سہولت رہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "فاداء تم" کا مطلب یہ ہے کہ تم نے قتل کے معاملہ میں اپنی طرف سے مدافعت کی (اور ہر شخص نے کہا کہ میں نے قتل نہیں کیا ہے) بولتے ہیں "ذمى أت هذا لأمر عتی" (اس معاملہ کو میں نے اپنے اوپر سے ہٹا دیا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "واید راعننا العناب" (اور اس (عورت) سے سزا اس طرح مل سکتی ہے) مفہوم کے اعتبار سے یہ قول بھی پہلے قول سے قریب ہے، کیونکہ نبی اسرائیل کے ہر فرد نے قتل کے سلسلے میں اپنی طرف سے مدافعت کی تھی اور کہا تھا کہ میں نے قتل نہیں کیا ہے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے تفصیل سے واقف ہو چکے ہیں۔ مجاہد ابن جریج اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے وہی تفسیر منقول ہے جو ہم نے بیان کی کہ "قتل کے بارے میں وہ باہم جھگڑنے لگے اور ہر فریق اپنی برائت اور دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بوڑھا شخص بڑا صاحب مال و دولت تھا۔ اس کے کئی بھتیجے تھے جو بالکل محتاج اور غریب تھے۔ لیکن مالدار بوڑھا لالہ لالہ تھا۔ اس کے بھتیجے انتظار کرتے رہے کہ ہمارا اچھا کبماتا ہے تاکہ اس کا سارا مال ہمیں مل جائے، لیکن بہت دن ہو گئے اور اس کی موت نہیں ہوئی تو شیطان نے انھیں بہکایا کہ تم اپنے چچا کو قتل کیوں نہیں کر دیتے۔ اس کا سارا مال تمہیں جلدی سے مل جائے گا، قتل کی ذمہ داری دوسری بستی والوں پر ڈال دینا اور ان سے بھی دیت وصول کرنا۔ وہاں پر آباد بنی اسرائیل کی دو بستیاں تھیں اور یہ انہیں سے ایک بستی میں رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے قتل کیا اور دوسری بستی کے شہریناہ کے دروازے پر لیا کر لاش ڈال دی صبح ہوئی تو اس بوڑھے کے قاتل اس کے بھتیجے ہی اس بستی میں سب سے پہلے پہنچے اور کہنے لگے کہ ہمارے چچا کو تمہیں نے قتل کیا ہے، تمہیں اس کی دیت بدل مال کی صورت میں ادینی پڑے گی۔ بستی والے قسم کھانے لگے کہ خدا گواہ ہے ہم نے نہ قتل کیا ہے اور نہ اس کے قاتل کو جانتے، رات میں دروازہ بند کرنے کے بعد پھر صرف اس وقت کھولا گیا ہے۔ درمیان کے کسی وقفہ میں ہم نے دروازہ کھولا بھی نہیں کھولا تھا۔ آخر حبرئیل علیہ السلام اللہ سمیع وعلیم کا حکم موسیٰ علیہ السلام کے پاس لائے اور کہا کہ آپ ان سے کہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے جسم پر اس کے گوشت کا ٹکڑا مارو۔ محمد بن کعب قرظی اور محمد بن قیس رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے جب دیکھا کہ لوگوں میں برائیاں بہت پیدا ہو گئی ہیں تو انہوں نے اپنی ایک لگ بستی آباد کر لی اور نافرمان اور برے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کا معمول تھا کہ جب شام ہوتی تو ان کی بستی کا جو شخص بھی باہر ہوتا اسے بستی میں بلا لیتے (اور دروازہ بند کر دیتے) اسی طرح جب صبح ہوتی تو اس بستی کا رئیس دیوار کے اوپر سے جھانک کر باہر کی طرف اچھی طرح دیکھتا، جب کوئی خاص چیز نظر نہ آتی تو دروازہ کھولتا لیکن ایک دن جب اس نے خوب غور سے ہر چیز ملاحظہ کرنے کے بعد دروازہ کھولا تو دروازہ سے لگی ہوئی ایک مقتول شخص کی لاش پڑی تھی مقتول کا بھتیجا اور اس کے ساتھی اور حامی چلانے اور شور کرنے لگے کہ تمہیں لوگوں نے اسے قتل کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ اصول تھا کہ جب بنی اسرائیل میں آپس ہی میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا مرض زیادہ بڑھ جاتا تو آپ مقتول کو جس محلہ میں پاتے اسی محلہ والوں کو پکارتے اس بستی والوں اور مقتول کے بھتیجوں اور ان کے حامیوں میں بات اتنی بڑھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپس میں قتل و خونریزی ہو جائے گی۔ دونوں فریق ہتھیار لیکر بھی پہنچ گئے تھے۔ لیکن کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور معاملہ موسیٰ السلام کی پاس پہنچا۔ مقتول کی طرف سے آئے ہوئے لوگوں نے جو خود قتل کے ذمہ دار تھے کہا کہ اس بستی والوں نے قتل کیا اور پھر لاش اپنے دروازے کے باہر ڈال دی۔ بستی والوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ خود واقف ہیں کہ ہم نے ان کی برائیوں سے کنارہ کش ہونے کیلئے ایک لگ بستی بنالی تھی، ہم نے نہ تو کوئی قتل کیا ہے اور نہ اس کے متعلق ہمیں کوئی علم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ عبیدہ اور ابن زید رحمۃ اللہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ وہ اختلاف و نزاع جو مقتول کے سلسلہ میں انہیں ہوا تھا اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود مدینہ کے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ "پھر تم آپس میں جھگڑنے لگے اور

اللہ کو وہ ظاہر کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے۔
 ”وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تُكْتُمُونَ“ یعنی مقتول کو تم نے خود قتل کیا پھر آپس ہی میں جھگڑنے لگے لیکن اللہ کو تو ظاہر کر دینا تھا اور اعلان کر دینا تھا اس کا جسے تم چھپا رہے تھے۔ ”اخْرَاجُ“ جس سے مُخْرِجٌ بنا ہوا اور یہاں چھپی ہوئی اور پوشیدہ چیز کے اظہار اور اعلان کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”اَلَا لَيْسَ الَّذِي يُخْرِجُ الْكِبٰبَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ (یعنی اللہ کی عبادت نہیں کرتے جو باہر لاتا ہے، آسمان اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو) میں بھی مُخْرِجٌ کا مطلب بظہر ہے یعنی ظاہر کرتا ہے جس چیز کو نبی اسرائیل چھپا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا وہ مقتول کا قاتل تھا۔ قاتل اور اس کے ساتھی اصل واقعہ کو چھپانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کر دیا اور حقیقت حال سب کو معلوم ہو گئی۔ ”وَتَكْتُمُونَ“ یعنی تم چھپاتے تھے، راز رکھنا چاہتے تھے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ ”تکتمون“ کی یہی تفسیر نقل ہوئی ہے ”فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا“ یعنی ہم نے موسیٰ کی قوم سے جنہوں نے مقتول کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا تھا، کہا کہ مقتول پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو جس کے ذبح کرنے کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے اور حکم کے مطابق تم نے ذبح بھی کر دیا ہے۔ مفسرین کے اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں کہ مقتول پر گائے کے جس ٹکڑے کو مارنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اس کے جسم کا کونسا حصہ تھا۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ گائے کی ران کو مقتول پر مارنے کا حکم ہوا تھا جب انہوں نے حکم کے مطابق مارا تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا اور اس نے خود بتایا کہ فلاں نے مجھے قتل کیا ہے، اور اس کے بعد پھر اس کی روح قبض ہو گئی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کے دونوں مونڈھوں کے درمیان کے حصہ کو مقتول پر مارا گیا تھا۔ پھر وہ زندہ ہو گیا تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھتیجے نے۔ ابو الجاہلیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کی کوئی ٹہری مقتول پر مارنے کا حکم ہوا تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گائے کے سرین کا حصہ مقتول پر مارا گیا تھا۔ عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ گائے کے گوشت کا کوئی ٹکڑا اس پر مارا گیا تھا ان تمام اقوال کی روشنی میں ہمارے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا“ میں صرف اتنا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اسرائیل کو یہ حکم دیا تھا کہ مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارو تاکہ وہ زندہ ہو جائے۔ نہ آیت میں اس طرف کوئی اشارہ ہے اور نہ حدیث صحیحہ میں واقعہ کی کوئی ایسی تفصیل موجود ہے جس کی روشنی میں بتایا جاسکے کہ گائے کے کس حصہ کو مقتول پر مارنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے انھیں دیا تھا۔ ممکن ہے وہ حصہ مونڈھے کا ہی ہو، ممکن ہے اس کے بجائے پونچھ کے مارنے کا حکم انھیں ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ران کے حصہ کو یا اس کے جسم کے کسی بھی خاص حصہ کو مارنے کا حکم ہوا ہو۔ اور اگر ہمیں اس کا کوئی علم نہ ہو کہ گائے کے کس خاص حصہ کو مقتول پر مارنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا تو اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر کسی ذریعہ سے ہمیں اس کا علم حاصل ہو جائے تو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اتنی بات تو بہر حال ہمیں ماننی ہی ہے کہ نبی اسرائیل نے مقتول کے جسم پر گائے کا کوئی حصہ مارا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا تھا۔ ذبح کی ہوئی گائے کے بعض حصہ کو مقتول کے جسم پر مارنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام اور آپس میں جھگڑنے والے نبی اسرائیل کو قاتل کا پتہ خود مقتول کی زبانی بتا دے اس طرح پوری تفصیل آیت میں ذکر نہیں ہے، لیکن آیت کی ترتیب سے خود سمجھ میں آتا ہے کہ گائے کو ذبح کرنے اور پھر اس کے جسم کے کسی حصہ کو مقتول پر مارنے کا مقصد یہی تھا۔ اس لئے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ ”پھر ہم نے کہا کہ مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارو، تاکہ اللہ تعالیٰ اسے زندہ کر دے۔ انہوں نے اسی طرح مارا تو اللہ تعالیٰ نے مقتول کو زندہ کر دیا اس طرح حذف و اختصار قرآن مجید میں اکثر ہوا ہے (اور گفتگو اور تحریر وغیرہ میں یہ ایک عام و معروف طریقہ ہے)“

سبق

”كٰذِبًا يَّخِيْطُ اللّٰهُ الْمُوَدِّيْنَ“ (یوں ہی اللہ مردوں کو زندہ کرے گا) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو خطاب کیا ہے اور مشرکین جو حشر و نشر کے منکر ہیں انھیں بھی قائل کیا ہے کہ نبی اسرائیل کے ایک مردہ کو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں زندہ کیا، اس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا ہے کہ اے موت کے بعد

حشر و نشر کا انکار کرنے والو! اس مقتول کے دوبارہ زندہ ہو جانے سے عبرت حاصل کرو، کیونکہ جس طرح میں نے دنیا میں اسے زندہ کر دیا تھا اسی طرح تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کروں گا اور قیامت کے دن انھیں جمع کروں گا۔ اس آیت کے سب سے پہلے مخاطب مشرکین عرب تھے، جو ایک ناخواندہ قوم تھی اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں تھی۔ انھیں اس طرح کا جو بھی علم تھا وہ انھیں یہودیوں کے واسطے سے تھا جو عرب میں رہتے تھے۔ یہ آیت انھیں کے اسلاف کے ایک واقعہ کو بیان کرتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کو بھی خطاب کیا تاکہ وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں جو ان سے بہت پہلے ایک قوم میں ہو چکا تھا اور اپنے عقیدوں پر نظر ثانی کریں۔ ”وَبَرِّئْكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“ (اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو) یعنی اے اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والو! اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلانے والو! اللہ تمہیں اپنی نشانیاں اور وہ دلائل و شواہد دکھاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ثابت کرتی ہیں، تاکہ تمہیں عقل آئے اور تم سمجھ سکو کہ واقعی آنحضرتؐ سچے اور حق پر ہیں اور ان پر ایمان ضروری ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنْ مِنْ

کام بیا کرے ایسے ایسے واقعات کے بعد تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو دیوں کہنا چاہئے کہ انکی مثال پتھر کی سی ہے بلکہ سختی میں پتھر سے بھی زیادہ سخت بعض پتھر تو

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيُزْجِرُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا

ایسے میں جن سے بڑی بڑی نہریں بھوٹ کر جلتی ہیں در ان ہی پتھروں میں بھٹے ایسے ہیں کہ جوشق ہو جاتے ہیں پھون سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑی ہی) پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں

لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِعَاقِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور سرتوڑے لڑھک آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارا اعمال پتھر نہیں ہیں

اور تم قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ“ مراد بنی اسرائیل کے منکر و کافر ہیں مقتول کے بد بختی نے تمہارا پچھانہ چھوڑا جن بھتیجوں کا ذکر پچھلی آیتوں میں ہوا ہے، کہا گیا ہے کہ انھیں کی طرف اشارہ ہے، انھیں سے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے“ ”قَسَتْ“ (جس کا ایک صیغہ ”قَسَتْ“ ہے) اور ”جَفِي“ اور

”عَفِي“ ہم معنی الفاظ ہیں سختی صلابت اور قسادت کے موقع پر ان کا استعمال ہوتا ہے۔ ”مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ“ یعنی اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ

نے اس مقتول کو زندہ کر دیا تھا جس کے قتل کے بارے میں وہ جھگڑ رہے تھے اور اس مقتول نے اپنے قاتل کی اطلاع بھی لوگوں

کو دیدی۔ یہ بھی انہیں معلوم ہو گیا کہ قتل کا اصل سبب کیا تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے سچ اور جھوٹ کو الگ الگ کر دیا، لیکن ان کا دل

پھر بھی سخت ہی رہا۔ جیسا کہ ہمیں روایتوں سے معلوم ہوا ہے، ان کے دل کی سختی یہ تھی کہ مقتول کے دوبارہ زندہ ہو جانے اور اس اطلاع

دینے کے بعد کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے قاتل پھر بھی اپنے سابقہ انکار پر جھے رہے اور یہی کہتے رہے کہ ہم نے اسے نہیں قتل کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مقتول پر گائے کا کوئی ٹکڑا مارا گیا تو وہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس

نے قتل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے بھتیجوں نے مجھے قتل کیا ہے۔ پھر اس کی روح قبض کر لی گئی جب دوبارہ وہ مردہ بنا دیا

گیا تو اس کے بھتیجے کہنے لگے کہ خدا کی قسم ہم نے اسے قتل نہیں کیا تھا۔ یعنی حق کے مشاہدہ کے بعد بھی وہ جھوٹ بولنے سے باز نہ آئے

اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ”پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے“ یعنی اس بوڑھے مقتول کے بھتیجوں کے

”پس وہ مثل پتھر کے ہیں۔ بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر“ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ اس کے بعد بھی جبکہ اللہ تعالیٰ

نے مقتول کو زندہ کر کے انھیں دکھا دیا اور اس کا معاملہ بالکل واضح اور صاف ہو گیا۔ پھر بھی تمہارا دل سخت ہی رہا۔

”فَهِیَ كَالْجَارِیَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً“ یعنی تمہارے دل (مثل پتھر کے ہیں، بلکہ سختی میں اسی سے بھی بڑھ کر) مطلب یہ ہے کہ حق دیکھنے کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے، سب کچھ تمہارے سامنے ظاہر ہو گیا تھا اور تم نے جو سمجھ لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کیا حق تم پر واجب ہے۔ پس قساوت اور سختی میں تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا جو حق تم پر واجب ہے اسے ماننے اور اس کا اقرار کرنے میں تمہارے دل پتھر کی طرح ہیں۔

کلمہ ”اَوْ“ کی تحقیق

”کَالْجَارِیَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً“ کا لفظ ”اَوْ“ کلام عرب میں عام طور سے شک کے اظہار کے لئے (یعنی یا) استعمال ہوتا ہے اور شک کا اظہار اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز نہیں ہے۔ اس کا ایک جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ اظہار اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہے، بلکہ ان لوگوں کے خیال اور نقطہ نظر کی اطلاع دے رہا ہے، جن کے ساتھ قاتلوں کا قتل کے معاملہ میں جھگڑا تھا اور جو صحیح صورت حال کو سمجھ گئے تھے اور اس پر یقین لائے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نشانی دیکھنے کے بعد بھی ان کے انکار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل پتھر جیسے ہیں یا سختی میں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لفظ ”اَوْ“ کے معنی کے متعین کرنے کے سلسلے میں عربی زبان و ادب کے ماہر علماء کے کئی اقوال ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ متکلم یعنی بولنے والے کو بعض اوقات جبکہ اسے اپنے طور پر یقین ہوتا ہے لیکن وہ مخاطب اور سننے والے کے سامنے اس معاملہ کو مبہم رکھنا چاہتا ہے تو کلام عرب میں ایسے مواقع کے لئے بھی ”اَوْ“ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس آیت کے علاوہ خود قرآن مجید میں متعدد دوسری آیتوں میں اسی طرح ”اَوْ“ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَأَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا“ اور ہم نے ان کو ایک لاکھ آبادی یا اس سے بھی زیادہ کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا (بھیجا) ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے: ”وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ فِي آيَاتٍ مُّبِينَةٍ“ (اور ہم یا تم ہی ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں)۔ حالانکہ متکلم خوب جانتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے۔ عام محاورہ میں بھی استعمال ہوتا ہے ”أَكَلْتُ بُسُوقًا أَوْ دُطْبِيَّةً“ (میں نے کچی کھجور کھائی یا پکی ہوئی تازہ) متکلم خوب جانتا ہے کہ اس نے کس طرح کی کھجور کھائی تھی لیکن وہ صرف مخاطب اور سننے والے کے سامنے صورت حال کو مبہم رکھنا چاہتا ہے کلمہ ”اَوْ“ کا استعمال ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جب کہ مذکورہ دونوں چیزیں مراد ہوں اور بعض علماء کا خیال ہے کہ آیت میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ بولتے ہیں ”مَا أَطْعَمْتُمْ إِلَّا حُلُوتًا أَوْ حَامِضًا“ (میں نے تمہیں میٹھی یا کھٹی چیزیں ہی کھلائی ہیں) تو یہاں ”اَوْ“ سے پہلے اور اس کے بعد جن دو قسموں کا ذکر ہے وہ دونوں ہی مراد ہیں۔ کلام میں ”اَوْ“ کا مطلب یہ نہیں لیا جاسکتا کہ متکلم کو اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ تھا کہ اس نے مخاطب کو میٹھی چیز کھلائی یا کھٹی، بلکہ وہ پورے یقین کے ساتھ اطلاع دے رہا ہے کہ میں نے تمہیں جو چیزیں کھلائی ہیں وہ میٹھی تھیں یا کھٹی، ان دو قسموں کے سوا کوئی تیسری قسم کی چیز میں نے تمہیں نہیں کھلائی، ان علماء کا خیال ہے کہ اسی طرح آیت ”فَهِیَ كَالْجَارِیَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً“ میں بھی مراد لیا گیا ہے، یعنی ان کے دل بس ان دو ہی اقسام میں منحصر تھے، یا وہ پتھر کی طرح سخت تھے یا اس سے بھی بڑھ کر سخت تھے۔ اس تفسیر کی بنیاد پر مطلب یہ ہو گا کہ ان انکار کرنے والوں میں بعض کے دل تو ایسے تھے جیسے پتھر اور بعضوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ”اَوْ“ بمعنی ”وَ“ (اور) ہے۔ اسی معنی میں قرآن مجید میں اور ایک موقع پر آیا ہے ”وَلَا تُظْهِرْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَافِرًا“ (اور ان میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آئیے ہٹی و کفوراً) جریر بن عطیہ کا ایک شعر میں بھی ”اَوْ“ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مَا أَتَىٰ مَرْبَةً مَّوْسَىٰ عَلَىٰ قَدْرٍ

نَالِ الْخَلَاءِ فَمَا أَوْكَانَتْ لَهُ قَدْرًا

انہیں خلافت مل گئی اور وہ ان کے لئے مقدر تھی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنی رب کے پاس وقت متعینہ پر حاضر ہوئے تھے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ ”اَوْ“ آیت میں ”بَل“ (بلکہ) کے معنی میں آیا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ”بس وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں“ جیسے آیت ”وَأَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا“ (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ کی آبادی یا اس سے بھی زیادہ کی طرف بھیجا) میں ”اَوْ“ بمعنی ”بَل“ (بلکہ) ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”تمہارا سے خیال کے مطابق

ان کے دل پتھر کی طرح ہیں، یا سختی میں اس سے بھی بڑھ کر۔ اُو کے سلسلے میں غننے بھی اقوال اس موقع پر نقل کئے گئے ہیں، ان سب کا ثبوت عربی زبان و ادب میں ملتا ہے، لیکن میرے نزدیک پسندیدہ قول وہی ہے جو میں نے ابتداء میں بیان کیا تھا اور آیت کی یہ تفسیر زیادہ بہتر رہے گی کہ کہا جائے کہ ان میں سے بعض کے دل پتھر جیسے ہیں اور بعض کے سختی میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ ”اُو“ کا استعمال کلام عرب میں ”و“ (اور) کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن اس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ جن دو چیزوں کے درمیان میں آئے ان میں سے کوئی ایک مراد لیا جائے۔ ایک ساتھ دونوں کو نہ ملا دیا جائے، اس لئے اگر آیت میں لفظ کے حقیقی معنی مراد لیکر تفسیر ممکن ہی تو پھر حقیقت کو چھوڑ کر مجازی معنی کیوں مراد لیا جائے؟

پتھر کی طرح جاتا ہے

”وَإِنْ مِنْ الْجِبَالِ مَاءٌ لَمَا يَشْرَبُ مِنْهُ إِلَّا نَهْمًا“ یعنی پتھروں میں ایسا بھی پتھر ہے جس سے پانی پھوٹ کر نکلتا ہے اور اس سے دریا بن جاتے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں پانی کا ذکر نہیں ہے، لیکن ”دریا“ کے ذکر کرنے سے خود پانی کا وجود ذہناً متحقق ہو جاتا ہے۔ ”تَجْرُ الْمَاءُ“ سے نکلتا ہے، اس وقت بولتے ہیں جب پانی سونت سے نکل کر نیچے گرتا ہے، ہر ایسی بہنے والی چیز کے لئے جو اپنی اصلی جگہ سے خارج ہوتی ہو اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں ”وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَشْرَبُ يَجْرُ مِنْهُ الْمَاءُ“ یعنی پتھروں میں ایسا بھی پتھر ہے کہ پھوٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے اور چشمہ اور دریا بن جاتا ہے ”وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَكْبُطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ“ یعنی پتھر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے خوف و خشیت سے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے زمین پر گر جاتا ہے۔ ان آیات میں کلمہ ”لَمَا“ میں لام خبر کی تاکید کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پتھر کے اوصاف بیان کرتا ہے کہ بعض پتھروں سے دریا پھوٹ نکلتے ہیں، بعض پھٹ گئے اور ان سے پانی کی سوتیں جاری ہو گئیں، اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کی ہیبت و خوف سے نیچے آگے ہیں، مقصد مقابلہ ہے ان پتھروں کا بنی اسرائیل کے ان افراد سے جو عقل رکھتے ہیں، فہم اور سمجھ اللہ تعالیٰ نے انھیں دی ہے اور اس کے بعد اپنی عظیم نشانوں کا انھیں مشاہدہ کرایا عجیب و غریب دلائل ان کے سامنے پیش کئے، لیکن اس کے باوجود اس سخت دلی اور قساوت کا مظاہرہ کیا جو پتھروں میں بھی نہیں پائی جاتی، کہ بہت سے پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو پھوٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی بہنے لگتا ہے اور بہت سے ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے نیچے گر جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ بتایا ہے کہ بہت سے پتھر بھی ایسے ہیں جو ان کے دل کے مقابلہ میں نرم ہیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے یہی تشبیہ روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہر وہ پتھر جس سے دریا پھوٹ کر نکلتا ہے جو پھوٹ جاتا ہے اور اس سے پانی بہنے لگتا ہے اور جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھک کر گرتا ہے تو اللہ کی خشیت اور اس کی ہیبت سے ایسا ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں اس کے متعلق ان آیات میں فرمایا ہے: ”تَتَادَهُ رَحْمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِ“ فرمایا کہ پتھر سخت ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس کی طرف سے معذرت کی ہے، لیکن شقی اور بد بخت انسانوں کی طرف سے کوئی معذرت نہیں کی یعنی پتھر میں تو ایسے بھی ہیں جن سے دریا پھوٹ کر نکلتا ہے اور جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔

علماء نحو کے ”ہبوط“ (گرنے) کے معنی کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں یعنی آیت کے یہ الفاظ کہ بعض پتھر ایسے ہیں جو اللہ کے خوف و خشیت سے گر پڑتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے اشارہ پہاڑ کے سایہ کے چھکنے کی طرف

”أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً“ میں کلمہ ”أَشَدَّ“ پر رفع کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی کافی پر عطف مانا جائے کیونکہ کاف کے معنی ”مثل“ ہیں اور یہ مرفوع ہے، اس لئے اس پر عطف مان کر ”أَشَدَّ“ بھی مرفوع ہو گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ”جہی“ کو مقدر مانا جائے، یعنی ”فہی کا لجا مالا وہی أشد قسوة“ (ابن جریر)

ہے کہ اللہ کی ہیبت سے ایسا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ مراد اس سے وہ پہاڑ (طور) ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تجلی کی تھی اور اللہ رب العزت کی تجلی سے پہاڑ چور چور ہو گیا تھا۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہیبت سے پتھروں کو معرفت اور سمجھ بھی عطا فرمائی ہے، وہ اللہ کی طاعت کی مہیاں رکھتے ہیں اور اس کی طاعت کرتے ہیں جیسے کھجور کے اس تنے کے متعلق احادیث میں آتا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطرہ دیا کرتے تھے کہ جب اسے (عمر بن جانے کے بعد) ہٹا دیا گیا تو اس سے رونے کی آواز آنے لگی اور جیسا کہ ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پتھر زمانہ جاہلیت میں مجھے سلام کیا کرتا تھا اور میں اسے اب بھی سچا مانتا ہوں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ آیت میں "اللہ کے خوف سے نیچے آگرتا ہے" ایسا ہی ہے جیسے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کے سلسلے میں) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "جِدْ اِذَا يُرِيدُ اَنْ يَنْفِثَ" (دیوار جو ابھی گرنا ہی چاہتی تھی) حالانکہ دیوار کوئی ذی روح چیز نہیں کہ اس کی طرف ارادہ کی نیت کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اللہ کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا پہاڑ گرنے ہی والا ہے" بعض علماء نے کہا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "دوسروں میں اللہ کی خشیت پیدا کرنے کا سبب ہے کہ اپنے بنانے والے پر وہ ایک کھلی نشانی ہے اسی طرح مذاقہ تاجوڈ" (تجارت کرنے والی اونٹنی) ایسی اونٹنی کے لئے بولتے ہیں جو اتنی عمدہ، فسر بہ اور اصلی نسل کی ہو کہ لوگ خوب بخور داس کی طرف متوجہ ہو جایا کریں۔ جسیر بن عطیہ کا ایک شعر ہے

فَأَعْلَىٰ وَأَدْنَىٰ لَيْلُهُ قَبْحِيئِرٌ

وَإِخْوَارٌ مِنْ نَبْهَانٍ أَمَّا تَمَّهَا سَمَاءُ

تاریک ہے اور جس کی رات روشن ہے

قبیلہ نبھان کا ایک کا نا جس کا دن

شاعر نے اپنے معاصر نبھانی کی بھوک کی ہے، لیکن تاریکی اور روشنی کی صفت کا رات اور دن کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے، حالانکہ مراد وہی نبھانی ہے، حقیقت میں رات اور دن مراد نہیں ہیں۔ آیت کی تفسیر کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں، یہ اقوال بھی ان سے کچھ بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ سلف کے مفسرین سے جو اقوال آیت کی تفسیر میں منقول ہیں، ان سے یہ مختلف ہیں اس لئے ہم ان اقوال کی روشنی میں کوئی تفسیر نہیں کر سکتے۔ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ "خَشِيئَةُ" کا معنی ڈر اور خوف ہے۔ "وَمَا لِلَّهِ بِمِثْلُ قَلِيلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ" یعنی اے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانے والو! اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والو! اور اے نبی کے متعلق جے سر و پاپا تیں گھڑنے والے نبی اسرائیل اور ان کے علماء! جو یہودے اور گندے اعمال تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اللہ صرف تمہیں ڈھیل دے رہا ہے اور آخرت میں تمہیں اس کا بدلہ دے گا یا پھر دنیا میں ہی اپنے جسام کا خمیازہ تم بھگت لو گے۔ "غَفْلَةٌ" جس سے غافل بھلا ہے، اکا اصل مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز بھول کر چھوڑ دی جائے یا کوئی کام انجام نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ انہیں خبر دیتا ہے کہ انکے برے اعمال سے وہ غافل نہیں ہے بلکہ سب کچھ اس کے احاطہ علم میں ہے۔

اَقْتَضَوْنَ اَنْ يَوْمِئِذٍ مِّنْكُمْ يَسْمَعُونَ كَلِمَةَ اللّٰهِ

اے مسلمانو! کیا اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی تمہارے کہنے سے ایمان لے آویں گے حالانکہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے گمراہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور پھر اس کا کچھ کا کچھ

تَمَّ يَحْرُوفُهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَغْفَلُونَ

کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (الطف یہ کہ) جانتے (بھی) تھے۔

ان سے آپ کو ایمان کی توقع ہے!

ایمان لائیں گے اور ان باتوں کی تصدیق کریں گے جو تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے رب کے پاس سے لیکر مبعوث ہوئے ہیں۔

ربیع اور قتادہ رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ آیت سے مراد یہودی ہیں کہ کیا تم ان سے ایمان لانے کی توقع رکھتے ہو۔ ”وَ قَدْ
 كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ“ حالانکہ انہیں کی ایک جماعت ”فَرِيقٌ“ تفریق سے فَعِيلٌ کے وزن پر جمع کا صیغہ ہے، لیکن لفظ ”طَائِفَةٌ“ کی طرح
 انہیں حسد و فتنے کے ساتھ اس کا کوئی واحد نہیں ہے، اگر وہ اور جماعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ”مِنْهُمْ“ یعنی بنی اسرائیل میں سے
 اشارہ بنی اسرائیل کی اس جماعت کی طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھی، اور ان کا ”کارنامہ“ ذکر کر کے ان یہودیوں کے
 متعلق کہا جا رہا ہے جو آنحضرت کے زمانہ میں مدینہ میں موجود تھے کہ جن کے اسلاف اور باپ دادوں نے یہ کارنامے انجام دیے
 ہوں اور جو خوب جان کی اتباع کو فخر سمجھتے ہوں، کیا تم ان سے توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے سننے سے ایمان لے آئیں گے۔ ”لَسِيْمَةٌ
 كَلَامَ اللّٰهِ تَمْ جِيْزٌ فَوْنُهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْا وَ كَلِمٌ يُعْلَمُوْنَ“ (ایسی تھی جو اللہ کا کلام سنتی تھی پھر اس میں تحریف اور تبدیلی کر دیتی تھی
 بعد اس کے وہ تجھ چکے تھے اور خوب جانتے بھی تھے مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ جس جماعت کا آیت میں ذکر ہو رہا
 ہے اس سے مراد کون لوگ ہیں؟ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”جو لوگ اللہ کے کلام میں تحریف اور تبدیلی کرتے تھے اور اسے
 چھپاتے تھے وہ بنی اسرائیل کے علماء تھے اور ایسے علماء بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مدینہ میں موجود تھے (سدی رحمۃ اللہ
 علیہ نے فرمایا کہ مراد تو ریت ہے جس میں وہ تحریف اور تبدیلی کرتے رہتے تھے، ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ مراد تو ریت
 ہے جس کو وہ کچھ سے کچھ کرتے رہتے تھے، اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے، اگر کوئی شخص ان میں سے حق پر ہوتا اور
 انہیں رشوت دیتا تو اس کا اللہ کی کتاب سے فیصلہ کرتے تھے اور اگر حق پر نہ ہوتا اور انہیں رشوت دکھاتا تو اس کے لئے بھی اللہ کی
 کتاب نکال لاتے تھے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص انہیں رشوت نہ دکھلاتا تو اور حق پر بھی نہ ہوتا تو اس کا
 فیصلہ صحیح صحیح کرتے تھے۔ اس مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا ہے کہ ”پس کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور جھلا دیتے
 ہو اپنے آپ کو، حالانکہ تم کتاب بھی پڑھتے ہو، تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سوچتے“ لیکن ان اقوال سے مختلف ایک دوسرا قول مفسرین
 کا، جیسا کہ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ ہے کہ (مراد موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بنی اسرائیل ہیں) اور جس طرح اللہ کا کلام نبی نے
 سنا تھا اسی طرح انہوں نے بھی سنا تھا، لیکن اس کے باوجود اسے کچھ سے کچھ کر دیا، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے تھے اور خوب اسے جانتے
 بھی تھے، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کے مطابق فرمایا کہ بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام
 سے اللہ کو دکھانے کا مطالبہ کیا تھا اور پھر انہیں ایک کڑک لے آپکڑا تھا۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیلی روایت میں منقول
 ہے کہ بعض اہل علم سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم اللہ کا دیدار تو نہیں
 کر سکے، لیکن جب آپ سے اللہ گفتگو کرے تو اس وقت ہمیں بھی اس کی گفتگو سنا دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں اس کے لئے
 دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، انہیں حکم دیجئے کہ وہ پاک ہو جائیں اور اپنے کپڑے پاک کریں اور روزے رکھیں، انہوں
 نے اس کے مطابق عمل کر لیا تو موسیٰ علیہ السلام انہیں لیکر نکالے اور طور پہاڑی پر پہنچے۔ پھر جب بادل نے انہیں چھپا لیا تو آپ نے انہیں
 حکم دیا اور وہ سجدہ میں گر پڑے اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام سے آپ کے رب نے کلام کیا۔ بنی اسرائیل نے بھی اللہ کا کلام سنا کہ اللہ
 تعالیٰ کچھ پیستروں کے کمرے کا حکم دے رہا ہے اور بعض چیزوں سے منع کر رہا تھا۔ بنی اسرائیل کے ان افراد نے جو کچھ سنا تھا اسے سمجھ
 بھی لیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام انہیں ساتھ لیکر بنی اسرائیل کے پاس واپس ہوئے، لیکن یہاں آنے کے بعد ان میں سے ایک جماعت
 نے اللہ کے حکم میں تحریف اور تبدیلی کر دی اور جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ تمہیں فلاں فلاں باتوں کا حکم دیتا ہے تو اس جماعت نے
 اللہ کے احکام کے خلاف اسے کہنا شروع کیا کہ نہیں، بلکہ ہمیں اللہ نے فلاں فلاں باتوں کا حکم دیا ہے اسی جماعت کا آیت میں ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے
 متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے ان دونوں تفسیروں میں بہتر و مناسب در آیت کی ظاہری ترتیب اور سیاق و سباق و مطابق ربیع بن النضر اور ابن اسحاق رحمہما اللہ کی وہ تفسیر
 ہے جو انہوں نے بعض اہل علم سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد دیے ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی طرح

اللہ تعالیٰ کا کلام خود اللہ رب العزت سے سنا تھا اور پھر سننے اور اسے سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف اور تبدیلی کر دی تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اللہ کے احکام میں تبدیلی ان میں سے ایک جماعت نے کی تھی جو اللہ کا کلام سنتے تھے۔ اللہ تعالیٰ بصیرت کیساتھ اس واقعہ کو بیان فرماتا ہے کہ ہر طرح کی حجت تمام کر دینے کے بعد بھی وہ بہتان تراشی اور اللہ کے کلام میں تبدیلی سے باز نہیں آئے اور پھر مومنین کو مخاطب کرتا ہے کہ ان لوگوں سے جو ایسے افراد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں تم توقع رکھتے ہو کہ وہ اس حق، نور اور ہدایت پر ایمان لائیں گے جسے لیکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس نور اور ہدایت کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ ان کیلئے غیب ہے، خود انہوں نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، ان کے اسلاف میں تو بعض ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کے کلام کو اس کے حکم اور نہی کو خود اللہ سے سنا اور پھر اس میں تبدیلی اور تحریف کر دی۔ پس انہیں کی نسل کے یہ لوگ جو آپ کے زمانہ میں ہیں، اگر آپ کا انکار کرتے ہیں اور اپنی کتاب کی ان آیات میں تحریف و تبدیلی کرتے ہیں جنہیں آپ کا ذکر ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں کہ انہوں نے کم از کم آپ کو اس طرح سے تو نہیں دیکھا ہے جس طرح ان کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلام ہونے دیکھا تھا اور نہ انہوں نے اللہ کو آپ سے کلام فرماتے سنا ہے۔ انہیں تو انکار و کفر کرنا ہی چاہئے۔ اس لئے اگر آیت ”یسمعون کلام اللہ“ سے مراد یہ لیا جائے کہ ”جو اللہ کی کتاب تو ریت سنتے ہیں“ تو پھر اس موقع پر اس جملہ کا کوئی خاص مفہوم باقی نہیں رہتا، کیونکہ جنہوں نے توریت میں تحریف کی تھی وہ بھی اسے سنتے تھے اور تمام دو سک بنی اسرائیل بھی سنتے تھے جن کا براہ راست تحریف و تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اس لئے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ صرف ان کی اس خصوصیت پر زور دینا کہ ”وہ توریت کو سنتے تھے“ خاص مفہوم نہیں پیدا کر سکتا جو اللہ تعالیٰ اس آیت میں مراد لینا چاہتا ہے، توریت تو سارے ہی یہودی سنتے تھے۔ اگر یہی مراد ہو تو یوں آیت ہوئی کہ ”کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ تمہاری وجہ سے ایمان لائیں گے، حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے کلام میں تحریف و تبدیلی کرتے ہیں، بعد اس کے کہ اسے سمجھ چکے ہیں اور وہ اسے خوب جانتے بھی ہیں“ (خاص طور سے اللہ کے کلام کو سننے کا ذکر نہ ہونا چاہئے تھا) لیکن آیت اس ترتیب کے ساتھ نہیں بیان کی گئی، بلکہ یہودیوں کے ایک خاص طبقہ ”فَرِیقٍ مِّنْهُمْ“ کا ذکر خصوصیت سے ہوا کہ انہیں اللہ کا کلام سننے کا بھی موقع دیا گیا ”لِیَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰهِ“ یہ ایسی خصوصیت تھی جو انبیاء کے سوا کسی اور کو حاصل نہ تھی لیکن اس کے باوجود تحریف اور تبدیلی سے باز نہ آئے، اللہ تعالیٰ نے ایک خاص جماعت کا ذکر یہاں ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے کیا۔ ”مُجْرِمُوْنَ“ یعنی اسے بدل دیتے ہیں، کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں، اصل میں ”اِنْجُوْف“ سے نکلا ہے، اس وقت اس کا استعمال کرتے ہیں جب ایک چیز اپنی اصل حجت اور سمت سے ہٹ کر دوسری طرف جھک جائے اللہ تعالیٰ آیت میں بتاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے کلام میں یہ تحریف و تبدیلی اس کے باوجود کی تھی کہ اللہ کے کلام کو سننے کے بعد اس کے مفہوم و مطلب کو خوب سمجھ بھی گئے تھے اور یہ جانتے ہوئے تبدیلی کی تھی کہ انکا یہ عمل حقیقت اور اصلیت کے خلاف ہے اور وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کے رسول موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ان کے دل کتنے پھرے ہوئے ہیں، پس یہ جو ان کی نسل کے بقایا ہیں۔ یہ بھی اپنے اسلاف کی طرح اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی اور حسد رکھتے ہیں۔

وَإِذْ الْقَوَّالِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِبَعْضِهِمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا

اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود و مسلمانوں تو ان سے تو کہتی ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعض (منافق) دوسرے بعض (غلامیہ) یہودیوں پاس تو وہ ان

أَخْلَوْا بِكُمْ بِمَا فَتَىٰ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِیُجَازِیَکُمْ بِمَا کُفَرْتُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّکُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

کہتے ہیں کہ تم کیا غضب کرتے ہو کہ (مسلمانوں کو وہ باتیں بتلاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے (توریت میں) تم پر منکشف کر دی ہیں) نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ لوگ تمکو حجت میں مغلوب کر دیں گے یہ عقول

أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

بیان کو اسکا علم نہیں کہ حق تعالیٰ کو سب خبریں ان چیزوں کی بھی جنکو وہ مخفی رکھتے ہیں اور انکی بھی جن کا وہ انظار کر دیتے ہیں۔

منافقین یہود

”وَإِذْ اتَّخَذُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَاوُوا آمَنًا“ (اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں) یہاں بھی انھیں یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کے اسلاف نے اللہ کا کلام خود سنے کے بعد اس میں تبدیلی کر دی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے ایمان کی توقع نہ رکھیں، اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ ”جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اس شریعت کی جسے آپ لیکر مبعوث ہوئے ہیں تصدیق کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اور تمہاری طرح ہم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی شریعت کی اتباع کرتے ہیں آیت میں یہودیوں کے اس گروہ کا ذکر ہو رہا ہے، جس نے منافقین کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منافقین یہود مراد ہیں کہ جب وہ مومنوں سے ملتے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو خدا نے تم پر منکشف کیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور قول یہ نقل ہوا ہے کہ یہودی منافقین جب مومنین سے ملتے تو کہتے ہیں کہ تمہارے نبی پر ایمان لے آئے ہیں، لیکن وہ ہمارے لئے نبی نہیں ہیں وہ تو صرف تمہارے نبی ہیں۔ اور آیت میں ان کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ سے روایت ہے کہ آیت میں وہ یہودی مراد لئے گئے ہیں جو ایمان لے آئے تھے، لیکن پھر منافق ہو گئے۔

”وَإِذْ أَخْلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَاوُوا نَحْوًا تَوَدُّ نَفْسُهُمْ بِمَا فَتَمَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ وَيَتَّبِعُونَ صُورَةَ اللَّهِ وَمَا لَمْ يَكُنْ لَهُ سَمْعٌ وَلَا بَصَرٌ وَلَا يَفْقَهُ شَيْئًا“ (اور جب آپس میں

ذہنی انتشار

تمہارے بعض پروردگار کے حضور میں قائل کر دیں گے) یعنی یہ یہودی جن کا ذکر چل رہا ہے جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی دوسرا نہیں ہوتا، تب یہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے۔ آیت کے اس ٹکڑے ”بِمَا فَتَمَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ“ (جسکا ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ ”کیا تم ان سے وہی کہتے ہو جسکا انہیں اللہ نے حکم دیا ہے“ (یعنی ایمان کا) تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو محض ان کا مذاق بنا رہے تھے، دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اس کی تفسیر میں یہ نقل ہوا ہے کہ جب وہ یہودی مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف تمہارے نبی ہیں، ہمارے لئے انکی نبوت نہیں ہے۔ لیکن جب وہ آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عربوں کو یہ نہ بتاؤ، کیونکہ پہلے تم اس نبی کے ذریعہ ان پر فتح پانے کے آرزو مند تھے لیکن وہ تو عربوں میں ہی مبعوث ہو گئے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی مطلب یہ ہے کہ ”کیا تم ان کے نبی ہونے کا اقرار کر لیتے ہو؟ تمہیں تو پہلے ہی سے معلوم ہے کہ تم سے ان کی اتباع کا عہد و پیمانہ لیا گیا تھا اور وہ خود بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا ذکر ہماری کتاب میں موجود ہے اور ہم ان کی بعثت کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کا یہواری طرح انکار کرو، ان کی منقلب یہ بھی نہ کہو کہ وہ صرف عربوں کے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اس کی بھی خبر ہے جسے ظاہر کرتے ہیں“ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”وَإِذْ اتَّخَذُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَاوُوا آمَنًا“ یعنی کیا تم انہیں بھی وہ اوصاف بتا دیتے ہو جو تمہاری کتاب میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کئے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کے اس ٹکڑے کی تفسیر میں تیسرا قول یہ نقل ہوا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی قریظہ کے یہودیوں کا محاصرہ کئے ہوئے تھے تو ایک دن آپ نے ان کے قلعہ کے نیچے کھڑے ہو کر فرمایا، اے بندوں کے بھائیو! اے خستہ روں کے بھائیو! اے باطل کے پوجنے والو!

اس پر انہوں نے آپس میں کہا کہ یہ باتیں کہ ہمارے آباء و اجداد میں بہت سے خدا کے عذاب کے نتیجے میں بند رہے اور خنزیر بنا دیئے گئے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کس نے کہا ہے یہ باتیں تو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہیں پر منکشف کی تھیں اور تمہیں میں سے نکل کر ان تک پہنچی ہیں، کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کیا ہے۔ وہ تمہیں اسی سے قائل کریں گے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے بیان کیا کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آنحضرت نے علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پاس بھیجا تھا۔ چونکہ قول سدری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ہے کہ اس آیت میں ان یہودیوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے جو پہلے ایمان لائے تھے لیکن پھر وہ منافق بن گئے۔ پھر وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سے اپنے آباء و اجداد پر عذاب الہی کے واقعات بیان کرتے تو اس پر انھیں بعض یہودیوں نے تنبیہ کی کہ ”اللہ تعالیٰ نے تم سے عذاب کے جو واقعات بیان کئے ہیں، کیا تم انہیں ان عربوں کو بتاتے ہو اگر تم ایسا کرو گے تو یہ عرب تم پر اپنی فضیلت جتانے لگیں گے اور تم لگیں گے کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں تم سے زیادہ محبوب اور تم سے زیادہ باعزت ہیں۔ پانچواں قول ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جب یہودیوں سے کسی چیز کے متعلق پوچھا جاتا تو بہت سے یہودی بتا دیتے کہ تو ریت میں فلاں فلاں واقعات بیان ہوئے ہیں اس پر ان کے سردار انھیں متنبیہ کرتے کہ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم انھیں وہ باتیں بتا دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کی ہیں، اس سے تو وہ اللہ کے یہاں تمہارے خلاف اسی کو دلیل بنالیں گے، تمہیں کچھ عقل بھی ہے۔“ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ ہمارے پاس مدینہ میں مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہ آئے۔ اس لئے یہود کے سرداروں نے اپنے ہاتھ والوں سے کہا کہ تم جا کر کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں (لیکن عقیدہ تمہارا نہ بدلے) اور پھر یہاں اپنے گھر واپس آکر انکار کر دیا کرو۔ وہ یہودی اپنے کاروبار کے لئے صبح کے وقت مدینہ آجاتے تھے اور عصر بعد اپنے گھر واپس چلے جاتے تھے ایک دوسری آیت میں بھی یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے ”وَقَالَتْ كَلَّا إِنَّهُ مِنْ آهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيْنَا لَمْ يُحْجِدُوا“ اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایمان لانے والوں پر جو نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور دن کے آخر میں اس سے انکار کر بیٹھو، عجب کیا کہ وہ بھی پھر جائیں۔

چنانچہ یہ یہودی جب صبح کے وقت مدینہ میں داخل ہوتے تو کہتے کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور مقصد یہ ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خبریں معلوم کریں، لیکن جب اپنے گھر واپس جاتے تو کفر و انکار کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس نفاق کی اطلاع دے دی تو ان کا اس طرح آنے جانے کا سلسلہ بند ہو گیا اور وہ مدینہ میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ جس زمانہ میں ان کا مسلمانوں کے پاس عام آنا جانا تھا تو مسلمان انہیں بھی سچا مومن ہی سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے پوچھتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں فلاں فلاں باتیں نہیں کہی ہیں؟

وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے واقعی ہمارے بارے میں یہ باتیں کہی ہیں (یعنی ان کی سرکشی اور عذاب وغیرہ کے متعلق) پھر جب وہ یہودی اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو ان کے سرداران سے کہتے کہ ”ارے کیا تم انھیں وہ بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے آیت زیر تفسیر ”يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِاللَّهِ عَلَيْكُمْ“ میں لفظ ”فتم“ کا اصل مفہوم مدد کرنا، فیصلہ کرنا اور حکم دینا ہے۔ بولتے ہیں اللّٰهُمَّ اِنَّمَا فُتِنْتُمُوْنَا بِرَبِّنَا“ یعنی اے اللہ میرے اور فلاں کے درمیان فیصلہ کر دے، قاضی کو اسی سے ”فِتْحًا“ (فیصلہ کرنے والا) کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اے اللہ ارشاد ”رَبَّنَا اِنَّمَا فُتِنَا وَبَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا لِحْقِ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِينَ“ میں بھی ”فتم“ کا یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے، یعنی اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے، اور آپ بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔ پس جب ”فتم“ کا معنی فیصلہ کرنا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زیر تفسیر آیت ”يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمُوْنَا بِاللَّهِ عَلَيْكُمْ لِيُجَاوِزَكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ“ کا مطلب یہ ہو گا کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ بتا دیتے ہو جسکا اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے اور جسکا تمہارے بارے میں فیصلہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم یہودیوں کو وہ تھا جو اس نے ان سے تو ریت میں میثاق اور عہد لیا تھا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی

شریعت پر ایمان لائیگے اور اس کا فیصلہ انکے بارے میں یہ ہوا تھا کہ ان میں سے اُس نے بند را اور سور بنا دیئے تھے اور اسکے علاوہ دوسرے احکام اور بہت سے عذاب اپنا نازل کئے تھے اللہ تعالیٰ کے یہ تمام احکام اور جب وہ نافرمانی اور سرکشی کرتے تو ہذا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کیلئے ان یہودیوں کے خلاف دلیل اور حجت تھے جو تورات پر نذر ایمان کا دعویٰ کرتے تھے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرتے تھے اسلئے میرے نزدیک ان مہترین کا قول آیت کی تفسیر میں زیادہ بہتر ہے، جنہوں نے کہا ہے کہ آیت "اَمْحَدُودُكُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ" سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہے۔۔۔۔۔

..... کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے شروع میں ان کی اس زود شن کو بتایا تھا کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ایمان لے آئے" اس کے بعد مسلسل "بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ" تک انھیں کے متعلق بیان ہوا ہے، اس لئے آیت کے آخری حصہ کو بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے پہلے حصہ کے مطابق ہونا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ آپس میں وہ ایک دوسرے کو ملامت ان کے اسی اقرار کی وجہ سے کرتے تھے جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے سامنے اپنے ایمان کا کیا کرتے تھے کہ "ہم بھی ایمان لائے اس شریعت پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے" دوسرے یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ یہی تو ہماری کتاب تورات میں بھی موجود ہے اور جب تم اس طرح اقرار کر کے اپنی کتاب کے مضمون کی صحابہ کو اطلاع دیدو گے تو وہ تمہارے خلاف اسی کو اللہ کے یہاں دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔ اصل بات یہ تھی کہ منافق یہودی اپنے ایمان کا یقین دلانے کیلئے ان اوصاف کی تفصیلات بھی صحابہ سے بیان کر دیتے تھے جو آخری نبی کے متعلق ان کی کتاب تورات میں موجود تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بتایا گیا کہ کمال مادی آتی تھی لیکن کفر سے بچ رہی باز نہیں آتے تھے "اَفَلَا تَعْقِلُونَ" جو یہودی صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے متعلق احکام بتا دیتے تھے انھیں دوسرے ان کے ہم مذہب ملامت کرتے ہوئے کہتے "اَفَلَا تَعْقِلُونَ" کیا تمہیں سمجھ نہیں عقل سے بالکل کورے ہو، ایسی باتیں بھی انھیں بتا دیتے ہو کہ وہ واقعی نبی ہیں اور ان کے لئے بھی نبی ہیں اور تمہارے لئے بھی نبی ہیں۔ کل اسی کو وہ تمہارے خلاف تمہارے رب کے پاس دلیل میں پیش کریں گے۔ ایسی باتیں ان سے نہ بتایا کرو۔ تمہارے لئے نقصان دہ ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَفَلَا يَعْلَمُونَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ" کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اس کی بھی جسے یہ جتلاتے ہیں خطاب یہودیوں سے ہے جو دوسرے یہودیوں کو اس بات پر ملامت کرتے تھے کہ مسلمانوں سے اپنی کتاب میں موجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کی تفصیل کو وہ کیوں بتا دیتے ہیں۔ ان کے بھائی بند اپنی کتاب کی راز کی باتیں بتا دینے والے یہودیوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتے ارے تم وہ باتیں بھی بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر منکشف کی ہیں، پھر تو وہ تمہارے خلاف اسی کو تمہارے رب کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ باتیں تم مسلمانوں سے چھپ چھپ کر اس وقت کرتے ہو جب تم آپس میں تنہا ہوتے ہو اور کوئی غیر نہیں ہوتا، مسلمانوں سے تو تم اپنی ان نجی مجلسوں کی گفتگو کو چھپا سکتے ہو، لیکن اللہ سے تمہاری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے، وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جنہیں تم ظاہر کرتے اور جتلاتے ہو، تمہارا اتفاق اور تمہاری دھوکہ بازی اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ چنانچہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی یہی تفسیر روایت ہے آپ نے فرمایا کہ جو چیز وہ چھپاتے تھے وہ ان کا کفر اور نجی مجلسوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور جھٹلانا تھا اور جو چیز وہ ظاہر کرتے تھے اس سے مراد ان کا وہ طرز عمل تھا کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو انہیں خوش کرنے کے لئے کہتے گتے کہ ہم بھی ایمان لے آئے، ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح روایت منقول ہے۔

علاء عیسا کہ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، بعض مفسرین کی یہی رائے ہے کہ "عِنْدَ دَعْوَانَا" کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے رب کے پاس حاضر ہونے یعنی قیامت کے دن تو تمہارے انہیں انجمنیاتیات سے تمہیں قائل کریں گے۔ لیکن بعض دوسرے ائمہ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ "عِنْدَ دَعْوَانَا" بعض تجزیہ قری کے مفہوم کے لئے آیا ہے، اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنی کتاب تورات میں لکھی ہوئی وہ علامتیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳ پر دیکھئے)

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَتْلُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمْثَانًا وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخُنُونَ ۝ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ

اور ان یہودیوں میں بہت سے ناخواندہ (یعنی جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن بلاسند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ اور کچھ نہیں (یہی بے بنیاد) خیالات بکا لیتے ہیں

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا

تو بڑی خرابی ان کی ہوگی جو کہتے ہیں (بدل بدل کر) کتاب (توریت) کو اپنی ہاتھوں سے پھر دعویٰ کر دیتی ہیں کہ یہ حکم خدا کی طرف سے آیا ہے (اور غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعے سے کچھ

فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝

قدرے قلیل وصول کر لیں سو بڑی خرابی (پیش نہ آئی) ان کو اسکی بدولت (بھی) جسکو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا اور بڑی خرابی ہوگی انکو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جسکو وہ وصول کر لیا کرتے تھے۔

لکیر کے فقیر

”مِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَتْلُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمْثَانًا“ (اور ان میں ان پڑھ بھی ہیں جو کتاب الہی کا کوئی علم نہیں رکھتے بجز جھوٹی آرزوؤں کے) ”مِنْهُمْ أُمِّيُونَ“ یعنی جن یہودیوں کے واقعات ان آیات میں بیان ہو رہے ہیں اور جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے سے اسلام لائیں گے اور جن کی عادت یہ تھی کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو انھیں خوش کرنے کے لئے کہتے کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں، تو اس آیت میں بھی انہیں کا بیان ہو رہا ہے۔ ابو العالیہ اور ربیع اور جابر رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ مراد یہودیوں میں کہ ان میں بہت سے آئی (ان پڑھ) میں ”آقی“ اسے کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”إِنَّا أُمَّةٌ أُمَّيَّةٌ“ (ہم امی (ان پڑھ) امت ہیں، حساب کتاب نہیں جانتے) میں بھی ”آقی“ سے ہی معنی مراد ہیں۔ چنانچہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”مِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَتْلُونَ الْكِتَابَ“ کا مطلب یہ ہے کہ ان میں ایسے بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسرا قول منقول ہے آپ نے فرمایا کہ آیت میں ”أُمِّيُونَ“ سے ایسے لوگ مراد ہیں جنہوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی اور اس کتاب کی تصدیق نہیں کی جسے اللہ نے نازل کیا تھا، بلکہ خود اپنی طرف سے کتاب لکھ لی اور پھر جاہل اور سبوتوف قسم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کتاب اللہ کی نازل کی ہوئی ہے، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں اس کی اطلاع دی ہے کہ وہ خود اللہ کی کتاب میں تبدیلی کرتے اور اپنی طرف سے اس میں لکھ لیتے ہیں، اس کے باوجود انھیں ”آقی“ اس لئے کہا کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کا انکار کرتے تھے۔ لیکن عرب میں لفظ ”آقی“ جو جانا پہنچانا، مشہور و معروف مفہوم ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول یہ مفہوم اس کے خلاف ہے، کیونکہ ”آقی“ تو عرب میں اسی کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ ”آقی“ ام زمان کی طرف منسوب ہے اور اسی حیثیت سے اس شخص کو کہتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) اور اوصاف اگر مسلمانوں کو بتا دے جو آخری نبی سے متعلق ہیں اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں تو مسلمان اس دنیا میں لوگوں کے سامنے نہیں قائل کریں گے اور کہیں گے کہ آنحضرت کے اوصاف تو خود تمہاری کتاب میں آخری نبی کی حیثیت سے موجود ہیں نہ یادہ راجح یہی قول معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اتنا تو یہود بھی مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حجت اور دلیل قائم کرنے اور کسی کو قائل کرنے کے لئے کسی خارجی سبب سے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ تو خود ہر چیز کو جانتا ہے اور اگر توریت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ذکر ہوئے ہیں تو توریت خود اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اسی کا کلام ہے اور تحریف و تبدیلی کے بعد بھی وہ تمام باتوں سے خود واقف ہے۔ یہ قول کہ آیت کی مراد اسی دنیا میں حجت قائم کرنے سے ہے، روح المعانی، تفسیر کبیر، بیضاوی اور مدارک وغیرہ میں موجود ہے۔

(مسترحم)

ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ کیونکہ لکھنے پڑھنے کا عربی میں رواج مردوں میں تھا، عورتوں میں نہیں تھا، اس لئے مردوں میں بھی جو شخص لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا اسے ”ام“ کی طرف منسوب کر کے ”امی“ کہتے تھے کہ اس حیثیت سے یہ ماں کے قریب ہے، باپ کے نہیں۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ”امی“ کا یہی مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں بھی مراد ہے کہ ”ہم امی (ان پڑھ) لوگ ہیں، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ“ (وہی تو ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا) میں بھی ”امی“ کا یہی مفہوم ہے۔ پس جب ”امی“ کا مفہوم عربوں کے یہاں جانا پہچانا یہی ہے تو اس لفظ کے مفہوم کے سلسلے میں ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی راجح ہو گا کہ ”ان میں وہ بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ لَا يُطْفُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أُمَمًا“ یعنی اللہ نے جو کچھ اپنی کتاب میں نازل کیا ہے اسے نہیں جانتے اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدود اور اس کے احکام کو نہیں سمجھتے بلکہ اس سلسلے میں ان کی مثال جانوروں جیسی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ”ان کی مثال جانوروں کی ہے جو کچھ نہیں سمجھتے اور کچھ نہیں جانتے کہ اللہ کی کتاب میں کیا ہے“ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے کہ ”وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اللہ کی کتاب میں کیا ہے“ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اور توریت نہیں پڑھ سکتے۔

آیت میں ”الْكِتَابَ“ سے مراد توریت ہے۔ لفظ ”کتاب“ کے شروع میں الف لام اس پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی خاص اور متعین کتاب مراد لی گئی ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان یہودیوں میں ایک جماعت ایسی ہے کہ نہ لکھنا پڑھنا جانتی اور نہ کتاب الہی کو سمجھتی ہے بس اس بات کی مدعی ہے کہ ہم اللہ کی کتاب توریت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اس میں ہے اسے جانتے ہیں ”إِلَّا أُمَمًا“ (بجز جھوٹی آرزوؤں کے) کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (جو کتاب الہی کا کوئی علم نہیں رکھنے بجز جھوٹی باتوں کے جو گھڑ گھڑ کے وہ اپنے منہ سے نکالتے رہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ ”إِلَّا أُمَمًا“ کا مطلب یہ ہے کہ ”بجز جھوٹی آرزوؤں اور تمنائوں کے جو اللہ سے انہوں نے قائم کر رکھی ہیں، حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں“ (کتاب الہی کا اور انہیں کوئی علم نہیں ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت میں اسی آخری تفسیر کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کچھ یہودی ایسے تھے جنہیں کتاب الہی کا کوئی علم نہیں تھا لیکن اپنے وہم کے مطابق جھوٹی روایتوں اور خرافات میں پڑے رہتے تھے اور کہتے کہ یہ کتاب الہی میں موجود ہے، حالانکہ اس کا اللہ کی کتاب سے کوئی تعلق نہ ہوتا یہ تو محض ان کی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ میرے نزدیک آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا وہ قول زیادہ مناسب ہے جو شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ جن ان پڑھ یہودیوں کا واقعہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کر رہا ہے اور جن کے متعلق ارشاد ہے کہ انہیں اس کتاب الہی کا کوئی علم نہیں جو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی تھی (یعنی توریت) اس کے بجائے وہ محض جھوٹے سندروايات اور خرافات میں پڑے رہتے ہیں۔ ”مَمْنِي“ (جس سے ”اممائی“ نکلا ہے) کا مفہوم آیت میں جھوٹ گھڑنا اور بولنا ہے۔ بولتے ہیں ”مَمْنِيْتُ كَذَا“ یعنی میں نے جھوٹ اور بہتان باندھا۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد ”مَا تَعْلَمُونَ وَلَا تَمْنُونَ“ میں بھی یہی مفہوم مراد لیا گیا ہے۔ یعنی نہ میں نے کوئی جھوٹ اور باطل اپنی طرف سے گھڑا ہے اور نہ کوئی بہتان تراشی کی ہے ”إِلَّا أُمَمًا“ کی تفسیر میں ہم نے جو رائے لکھی ہے، اس کے مناسب اور درست ہونے کے لئے دوسرے دلائل کے علاوہ ایک دلیل خود آیت میں بھی موجود ہے، اسی کے بعد ارشاد ہے ”وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْتَوُونَ“ (اور یہ محض تخیلات میں پڑے رہتے ہیں) یعنی یہ باطل اور جھوٹی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے اپنے خیالات ہیں اور صرف وہم و گمان کے درجہ کے، یقین اس پر نہیں ہے۔ ”إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْتَوُونَ“ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کچھ بھی نہیں، محض ان کا وہم و گمان ہے۔ ”إِنْ“ (ما دلفی) کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”قَالَتْ لِمَ كَرِهْتَ الْإِسْلَامَ إِذْ بَشَرْنَا بِنَبِيِّكَ“ (ان سے ان کے پیغمبروں نے کہا، بیشک ہم تمہارے ہی جیسے بشر ہیں)

ہیں بھی "ان" کا (لفظی) کے معنی میری استعمال ہوا ہے۔ "اِنَّ يٰظُنُّوْنَ" کا مفہوم یہ ہے کہ صرف شکوک و شبہات میں پڑے ہوئے ہیں ورنہ حقیقت کا انھیں کوئی علم نہیں ہے۔ "ظن" آیت میں شک و شبہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان یہودیوں میں ایسے بھی ہیں جو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانتے نہ کتاب اللہ کا انہیں کوئی علم ہے اور نہ اسے سمجھتے، صرف اپنے وہم و گمان اور اپنے تخیل کے مطابق چند خرافات اور جھوٹی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس پر بھی یقین نہیں رکھتے، بلکہ اس میں بھی شک و شبہ ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہودیوں کا یہ جاہل اور ناخواندہ طبقہ اپنے سرداروں اور اپنے علماء و اجارے کے کچھ باتیں سنتا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ بھی کتاب اللہ ہی میں سے ہے، حالانکہ اللہ کی کتاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے کہ یہ اس چیز کی تو تصدیق کرتے نہیں جس کے متعلق یقین ہے کہ واقعی اللہ کی طرف سے ہے، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شہادت اور دین کو تو چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بجائے ان چیزوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جن کے بارے میں خود انہیں شک و شبہ ہے یعنی وہ باتیں جنہیں ان کے سرداروں اور علماء نے محض اللہ اور اس کے رسول سے عناد اور دشمنی میں انھیں بتائی ہیں۔ آیت کی یہی تفسیر اسلاف سے منقول ہے چنانچہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "ان ظنوا ان اللہ یظنون" یعنی محض جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ ہے اسے نہ جانتے نہ سمجھتے، محض گمان اور اپنے وہم سے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ قتادہ ابو العالیہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ بہت سے تخیلات و اوصاف میں پڑے ہوئے ہیں حقیقت سے الگ کا کوئی تعلق نہیں۔

تہا ہی کے راستہ پر

قَوْلِهِمْ "لَا يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَوْا وَا يَهْتَمُّوا قَلِيْلًا" (پس، عذاب ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب الہی کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں۔ پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس سے قلیل معاوضہ حاصل کریں) "ویل" کے مفہوم کے سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا مفہوم "عذاب" نقل ہوا ہے یعنی پس ان کے لئے عذاب یہ ہے "ابو عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "ویل" وہ خون آلود پیپ ہے جو جہنم میں سب سے نیچے بہتی ہوگی، ایک روایت میں آپ سے ہے کہ جہنم میں پیپ کی وادی کا نام "ویل" ہے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ویل" جہنم کا ایک پہاڑ ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ویل" جہنم کی ایک وادی ہے، اس کی گہرائی اتنی ہے کہ جب کافر کو اسکے اندر ڈالا جائے گا تو چالیس سال کے بعد اس کی نیت تک پہنچے گا، ان روایات کی روشنی میں آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ "پس جہنم کے قعر اور سب سے نیچے حصہ میں خون آلود پیپ کا عذاب ان یہودیوں کو ہوگا جو اللہ کی کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔" "الَّذِيْنَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَوْا وَا يَهْتَمُّوا قَلِيْلًا" سے نبی اسرائیل کے وہ یہودی مراد ہیں جنہوں نے اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب میں تحریف اور ترمیمی کی اور پھر اپنی طرف سے اپنے منشاء کے مطابق ایک ایسی کتاب لکھی جو اس کتاب الہی سے مختلف تھی جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا اس کے بعد اپنی طرف سے لکھی ہوئی اس کتاب کو جو وہ معجزی اور قلیل، منفعت کے بدلے میں ان لوگوں کو چھتے تھے جنہیں کتاب الہی کا کوئی علم نہیں تھا اور نہ وہ اس سے واقف تھے کہ توریت میں کیا لکھا ہوا ہے، اللہ کی کتاب کے مضامین سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں کے متعلق فرماتا ہے کہ خون آلود پیپ کا عذاب ہوگا۔ ان لوگوں کو اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے اور اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے تھے سیدی رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے آپ نے فرمایا کہ یہودیوں میں کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی طرف سے ایک

شہ قابل اس سے بھی مراد وامن پہاڑ اور وادی ہی ہے (مترجم)

کتاب لکھی اور پھر اسے عربوں کو بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، ایسا وہ محض قلیل دنیاوی معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت میں ”اُمّیّون“ سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول کی تصدیق نہیں کی اور نہ اس کتاب کی تصدیق کی جسے اللہ نے نازل کیا تھا، اس کے بجائے انہوں نے خود ہی ایک کتاب لکھ ڈالی اور جاہل اور بے وقوف لوگوں سے کہنے لگے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے ان کا مقصد محض یہ تھا کہ اس کے ذریعہ معمولی پونجی حاصل کریں۔ فرمایا کہ ”ثمننا قلیلاً“ یعنی معمولی دنیاوی منفعت۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو جانتے اور سمجھتے تھے کہ اللہ کی کتاب میں وہ تعریف و تسمیہ ملی کر رہے ہیں، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ افراد نے لوگوں کو بھیجنے کے لئے خود ہی کتاب لکھ ڈالی اور دعویٰ کیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں تھی۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (توریت) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامتیں بیان کی تھیں انہیں ان یہودیوں نے بدل ڈالا اور کتاب الہی میں اس تبدیلی سے ان کا مقصد محض دنیا کی پونجی حاصل کرنا تھا۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”ویل“ جہنم میں ایک پہاڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل کی ہے، کیونکہ انہوں نے توریت میں تحریف اور تبدیلی کی تھی، جو چیزیں انھیں پسند تھیں وہ اللہ کی کتاب میں لکھ دی تھیں اور اللہ کی نازل کی ہوئی جو باتیں انھیں پسند نہ آئیں انھیں کتاب الہی سے مٹا دیا، اسی ضمن میں انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی توریت سے مٹا دیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر غضب ناک ہوا اور ارشاد فرمایا کہ ”عذاب ہو گا ان پر اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور اسکی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں۔“ ”کتابت“ دیکھنا، ہاتھ سے ہونا ہے اور جب بھی لکھنے کا ذکر ہو گا تو یہی سمجھا جائے گا کہ لکھنے والے نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آیت میں ”کتابت“ کے ساتھ ”بایدیم“ (اپنے ہاتھوں سے) کا اضافہ تاکہ یقین کیا ہے کہ خوب جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ محض جھوٹ، فریب اور اللہ کی کتاب کے خلاف ہے، لیکن پھر بھی تحریف و تبدیلی کرتے ہیں اور دل کھول کر کرتے ہیں۔

”فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَيْدِيْهِمْ وَّوَيْلٌ لِّمَنْ يُّكْسِبُوْنَ“ (سو عذاب ہے ان کے لئے اس کی بدولت جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا اور عذاب ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں) ”فویل لهم“ یعنی جہنم کے سب سے نچلے حصہ میں، جہاں پیپ کی وادی بہتی ہے انہیں عذاب ہو گا، یعنی ان بنی اسرائیل کے یہودیوں کو یہ عذاب ہو گا جن کے متعلق ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں تحریف و تبدیلی کر کے خود کتاب لکھتے تھے اور پھر کہتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس سے ان کا مقصد صرف دنیا کی معمولی پونجی حاصل کرنا ہوتی تھی۔ ”وَمَا كُنْتُمْ اَيْدِيْكُمْ“ یعنی اس کی بدولت جسے ان کے ہاتھوں نے لکھا، اسی طرح انھیں جہنم کی سب سے نیچے کی وادی میں پیپ کا عذاب ہو گا اس کی بدولت جو وہ گناہ اور برے اعمال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے خلاف اپنے ہاتھ سے لکھ کر حرام کمانی کرتے ہیں اور اسے کھاتے ہیں یہ لوگ جسے بھی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی وہ کتاب بیچتے تھے اس سے یہی کہتے تھے کہ یہ التشریط سے

۱۰ توریت میں تبدیلی اور تحریف کا اعتراف اب عام طور سے یہودی بھی کرتے ہیں اور کٹر سے کٹر یہودی کو بھی اس پر اصرار نہیں کہ توریت واقعی وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، انیسویں صدی سے اب تک خود یہودی اور عیسائی علما نے ہزاروں کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اور کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ موجودہ توریت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے قطعی طور پر مختلف ہے اور جو توریت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اس کا آج دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ یہودی جو توریت کو مانتے ہیں اور اس کے احکام پر عمل کے دعویدار ہیں وہ بھی اس کے معترف ہیں کہ موجودہ توریت اپنے فرقہ کے خدا رسیدہ بزرگوں کی تصنیف ہے اللہ کا وہ کلام نہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ خاصانِ خدا نے الہامِ خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترمیم و تالیف دیا، اللہ تعالیٰ کے کلام کا یہ بھی اعجاز ہے کہ تیرہ سو سال پہلے جو دعویٰ اسے کیا تھا آج سب ہی اسکا اعتراف کر لیا۔

ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”ہما یکسبون“ سے گناہ مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”قویل لہم“ ان پر عذاب ہوگا، یعنی اس کی بددلت کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے یہ جھوٹ لکھا تھا۔ ”وویل لہم ہما یکسبون“ یعنی ان پر عذاب ہوگا اس کی بددلت جو وہ نادانوں اور جاہلوں کو جھوٹ بیچ کر کھاتے ہیں۔ ”کسب“ (جس سے یکسبون نکلا ہے) کا اصل مفہوم عمل ہے۔ کوئی کام اگر کوئی شخص پیشے کے طور پر اختیار کرتا ہے یا کوئی صنعت سیکھتا ہے تو اس کے لئے ”کاسب“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ نَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ

اور یہودیوں نے یہ بھی کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوگی (بھی) نہیں مگر بہت اٹھوڑے روز (جو انگلیوں پر شمار کر لیا جا سکتا ہے) اور یہودیوں کو یہ لگتا ہے کہ اس کے متعلق کوئی عہد ہے

يَخْلِفُ اللّٰهُ عَهْدًا اَمْ تَقُولُونَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ نَالَمِنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ

لے لیا ہے (یہاں اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو فلاں کرے گا یا دوسری اللہ تعالیٰ کو ذمہ لے لیا ہے) تو جسکی کوئی علمی سند یا اس نہیں رکھتے۔ کیوں نہیں جو شخص قصداً بری باتیں کرتا ہے اور اسکو اسکی

اِحاطت بہ خطیئہ فاولیک اصحاب النار ہم فیما خلدون ۝ والذین امنوا

خطا (اور قصور اس طرح) احاطہ کرے کہ کہیں بھی کا اثر تک نہ رہے سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہوتے ہیں اور وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ اللہ اور رسول پر

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ ہُمْ فِيْہَا خٰلِدُونَ ۝

ایمان لادیں اور نیک عمل کریں ایسے لوگ اہل بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

وَقَالُوا لَنْ نَمْسَنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُودَةً یعنی یہودی کہتے ہیں کہ آگ (دوزخ کی) ہمارے جسم کو چھوئے گی بھی نہیں۔ اور نہ اس میں ہم داخل ہوں گے کبھی چند گنے چنے دنوں کے۔ ”ایام“ (دن) کی صفت

”معدودۃ“ (گنے چنے) اس لئے لائے اور ان چند گنے چنے دنوں کی تعیین اس لئے نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ ان آیات میں یہودیوں کے متعلق

نبردے رہا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دوزخ میں وہ چند متعین دن ہی رہیں گے، یہودیوں کے یہاں ان دنوں کی مدت

جانی پہنچانی تھی کہ کتنے دن انھیں دوزخ میں رہنا ہوگا، اس لئے ان کی تعیین اللہ تعالیٰ نے نہیں کی کہ وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ جو میں مفسرین

کے اس سلسلے میں کئی اقوال نقل ہوئے ہیں کہ یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق وہ کتنے دن تھے جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ انھیں ان میں دوزخ

میں رہنا پڑے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تذکرہ اللہ کے دشمن یہودیوں کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب صرف

قسم پوری کر لے کے لئے دے گا اور ہم جہنم میں صرف اتنے ہی دنوں کے لئے جائیں گے جتنے دن ہم نے دوسری علیہ السلام کے زمانہ میں

ان کے آباء واجداد نے (گو سالہ پرستی کی تھی) یعنی چالیس دن کے لئے جب یہ چالیس دن پورے ہو جائیں گے تو ہم پر سے عذاب بھی ختم

ہو جائے گا۔ قتا وہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح روایت ہے سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم پر صرف چالیس دن

کے لئے عذاب ہوگا، پھر آگ ہمارے گناہوں کو کھا جائے گی اور ہمیں پاک و صاف کر دے گی تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ نبی اسرائیل

کے اولاد کے ہر اس شخص کو جس نے نختہ کر یا ہے نکال دو۔ اسی لئے ہمیں حکم ہوا ہے کہ ہم نختہ کریں، ان کا عقیدہ تھا کہ چالیس دن کے بعد

یہودیوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہودی کہتے تھے کہ ہمارے رب نے ہماری ایک

لفزش (گو سالہ پرستی) کے سلسلے میں ہم پر عتاب کیا اور قسم کھائی کہ چالیس دن تک ہمیں عذاب دے گا۔ پھر اس کے بعد ہمیں عذاب سے

نکال لے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ یہودی تو ریت میں یہ لکھا ہوا پاتے تھے کہ جہنم کے دونوں

کناروں کی مسافت چالیس سال کی ہے اور اس کے اندر ایک درخت اگا ہوا ہے جسے "شجرۃ الزقوم" کہتے ہیں جب بنی اسرائیل اس درخت تک پہنچ جائیں گے تو انھیں جہنم سے نکال لیا جائے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ "جہنم" دوزخ کو کہتے ہیں اور اس کے اندر "شجرۃ الزقوم" (توہر کا درخت) ہے۔ ان اللہ کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا کہ جہنم میں رہنے کے جو گئے چنے دن یہ اپنی کتاب میں پاتے ہیں ان میں اس درخت تک کی مسافت یہ طے کر لیں گے جو جہنم کے اندر ہوگا، پھر جب متعینہ دن جہنم کے اندر پورے ہو جائیں گے تو ان سے عذاب بھی ختم ہو جائے گا اور جہنم بھی ختم ہو جائے گی۔ ان کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ "وَلَنْ نَسْتَأْذِنَكَ الْتَأْذِنًا لَّأَيَّامًا مَّعْدُودَةً" میں کیا گیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب وہ جہنم کے دروازے سے داخل ہوں گے تو ان پر عذاب شروع ہو جائے گا، پھر جب اپنے گمان و خیال کے مطابق عذاب کے چند گئے چنے دن آخر میں "شجرۃ الزقوم" تک پہنچیں گے تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ تم تو یہ سمجھتے تھے کہ عذاب تمہیں صرف چند گئے چنے دن ہی میں ہوگا اور اس کے بعد تم نجات پا جاؤ گے، لیکن اب وہ دن پورے بھی ہو گئے اور تمہیں جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حجت کرنے گئے اور کہنے لگے کہ ہم تو صرف چالیس دن کے لئے جہنم میں جائیں گے، اس کے بعد ہمیں وہاں سے نکال لیا جائے گا اور دوسرے لوگ ہماری جگہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے، ان کا اشارہ دنو ذب اللہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جمعین کی طرف تھا۔ اس پر حضور اکرم نے ان کے سروں کی طرف اپنے دست مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو تم جہنم میں ہمیشہ کے لئے ڈالے جاؤ گے اور تمہاری جگہ پر کوئی دوسرا جہنم میں نہیں جائے گا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روایتوں میں نقل ہوئی ہے، عذاب آخرت سے متعلق یہودیوں کے عقیدہ کے سلسلے میں دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ شیاطین مدت سات ہزار سال ہے اور ہر ہزار سال کے بعد لے میں اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں صرف ایک دن عذاب دے گا، اس طرح مدت دن آخرت میں اللہ تعالیٰ عذاب دے گا، ان کے اس عقیدہ کی تردید کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ "وَقَالُوا لَنْ نَمْسُكَ النَّارُ يَا مَعْزُومٌ" مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔

مَدَقُلُ امْتَحَنُ تَمَّ عِنْدَ اللّٰهِ عَمْدًا فَلَئِنْ يَخْتَفِ اللّٰهُ عَمْدًا كَاَمِّ تَقْوُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ" (آپ کہنے کیا تم اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کوئی وعدہ پانچکے ہو، جو اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا؟ یا یہ نہیں اللہ پر وہ جوڑے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے) یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہیں دوزخ میں صرف چند گئے چنے دنوں کے لئے ڈالا جائے گا اور پھر مدت متعینہ کے ختم ہونے پر انہیں سے انہیں نکال لیا جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق ان سے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پچھواتا ہے کہ تم جو اس طرح بڑھ چڑھ کے دعویٰ کر رہے ہو تو کیا اللہ تعالیٰ نے تم سے اس سلسلے میں کوئی وعدہ کیا تھا کہ اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا یا تم ہی اپنی طرف سے اللہ پر اپنی جہالت اور بے جا حرات کی وجہ سے جوڑتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے "امتنن تم عند اللہ عدا" کی تفسیر میں روایت ہے کہ کیا تم جو دعویٰ کر رہے ہو اس پر اللہ کے یہاں سے تم کوئی وعدہ پانچکے ہو، کوئی اس کی دلیل تمہارے پاس ہے؟ قنابہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اگر تم نے لا الہ الا اللہ کہا ہوتا اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا، پھر اسی پر تمہاری موت ہو جاتی تو میرا جیسا کہ تم سے وعدہ تھا کہ میں تمہیں اس پر ثواب دوں گا، تمہارا یہ عقیدہ یقیناً تمہارے لئے ذخیرہ آخرت بنتا۔ لیکن کیا تم نے اپنا یہ عقیدہ باقی رکھا؟ کیا تم میرے ساتھ شرک و کفر سے باز آئے؟ اگر تم نے اپنا عقیدہ میرے کہنے کے مطابق رکھا ہوتا تو واقعی تمہیں اس دعوے کا حق تھا، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا بلکہ میرے ساتھ شرک و کفر کیا تو پھر اب اللہ کی طرف وہ باتیں کیوں منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں یہودیوں کے متعلق فرمایا ہے کہ "امتنن تم عند اللہ عدا" (کیا تم اللہ کے یہاں سے کوئی وعدہ پانچکے ہو؟) دوسرے موقع پر یہی مضمون ایک اور انداز میں بیان ہوا ہے۔ "وَمَنْ هُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ" اور جو کچھ تراشتے رہتے ہیں اس نے انہیں دھوکے میں ڈال

رکھا ہے) اور آیت "بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً رَّجُوسًا" کے بعد آ رہی ہے) میں جزا اور سزا کا اصل قانون بیان ہوا ہے کہ تو اسے نیکی پر اور عذاب برائی پر ہوتا ہے، تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ اپنے تمام بندوں سے کیا ہے (نبی اسرائیل کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں) وہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے گا اور اس کے حکم کی اطاعت کرے گا وہ قیامت کے دن اس کے عذاب سے نجات پائے گا، ایمان سے مراد لالہ اللہ کا اقرار ہے اور اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا وعدہ ہے کہ جو شخص بھی اپنا یہ عمل قیامت کے دن لیکر حاضر ہوگا اسے وہ ضرور نجات دے گا۔ آیت کی تفسیر میں ہم نے جتنے بھی اقوال نقل کئے ہیں، اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن مفہوم اور مطلب سب کا ایک ہے۔

اور فرماتا ہے کہ جزا اور سزا کا اصل قانون یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلاتا ہے اور اس کا گناہ اسے گھیرے رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے ڈال دینے جائیں گے اس کے برعکس جنت میں صرف وہی لوگ داخل کئے جائیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں گے، جنہوں نے اللہ کی طاعت کی ہوگی اور اس کے حدود کو قائم کیا ہوگا۔ آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ "جس نے تمہاری طرح اعمال کئے اور تمہاری طرح کفر کیا، یہاں تک کہ اس کا کفر اس کی اچھائی پر محیط ہو گیا تو یہی لوگ اہل جہنم ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے آپ نے فرمایا کہ کلمہ "بلی" کلام منافی کے جواب میں بولا جائے تو اس کے الکار اور اس کے بعد آنے والے کلام کے اقرار کیلئے ہوتا ہے، جس طرح کلام مثبت کے جواب میں کلمہ "نعم" کا مطلب اقرار و اثبات ہوتا ہے اور "سئیۃ" سے آیت میں مراد اللہ کے ساتھ

قانون جزا و سزا

شُرک ہے، ابو ذر، عابد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے "سئیۃ" کا مفہوم شرک نقل ہوا ہے، سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "سئیۃ" وہ گناہ ہے جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے کفر یا جہنم سے ہے۔ "سئیۃ" کا اصل مفہوم عام ہے یعنی ہر برائی اور گناہ کو کہہ سکتے ہیں، آیت میں بظاہر اس کی کوئی تخصیص نہیں معلوم ہوتی کہ اس سے کوئی خاص گناہ ہی مراد لیا جائے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آیت میں جس "سئیۃ" کا ذکر کیا ہے اس کا بدلہ "جہنم میں ہمیشہ رہنا" بھی بتا دیا ہے، اس لئے یہی کہا جائے گا کہ یہاں "سئیۃ" سے مراد خاص گناہ ہے، کیونکہ ہر گناہ کی سزا جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا نہیں ہوتی، بلکہ صرف شرک و کفر ہی پر اس سزا کی وعید اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اہل ایمان کو جہنم میں ہمیشہ کیلئے رہنا نہیں ہوگا۔ آیت اگرچہ آپ پڑھ لیں، جیسا کہ ہم نے اس سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے اور شاذ ہے۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی بدی اختیار کرے گا اور اس کا گناہ اس کو گھیرے گا تو یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ اہل جنت ہیں، تمام اسلاف صحابہ اور تابعین کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ آیت میں "سئیۃ" سے مراد عام نہیں ہے، بلکہ خاص کفر و شرک مراد ہے۔ اس لئے اس میں عام گناہ کبیرہ "کو بھی داخل کر کے اس کے مرتکب کو بھی اسی سزا کی وعید غلط اور امت کے اجماع کے خلاف ہوگی۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں متواتر طریقوں سے ثابت ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمان ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں بھیجے جائیں گے، حضور اکرم کی یہ احادیث اتنی روایتوں سے ثابت ہیں اور صحابہ، تابعین اور اس کے بعد کے تمام علماء و علماء نے اتنی کثرت کے ساتھ اس سلسلے کی احادیث کو نقل کیا ہے کہ ان احادیث کے انحصار سے ثابت ہونے کا انکار کسی شخص کے لئے ممکن نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے بیان و شرح کا حق دیا تھا اور شریعت میں آپ ہی کا بیان حجت اور دلیل ہے، اس لئے آپ سے منقول ان متواتر احادیث کی روشنی میں یہی فیصلہ کیا جائے گا کہ "سئیۃ" سے مراد خاص گناہ یعنی کفر و شرک ہے اور "کبار" کا مرتکب ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں داخل ہوگا۔ "وَ اَخَاطُ بِهٖ خَطِيئَةً" یعنی اس کے گناہ نے اسے گھیرے رکھا اور توبہ اور رجوع سے پہلے اس کی موت واقع ہوگئی، کسی چیز کے "اخاط" کا مطلب ہوتا ہے اس کو گھیرے رکھنا، جس طرح دیوار (حائط) کے ذریعہ گھر کو گھیرے میں لے لیا جاتا ہے اور اس طرح اس کی حفاظت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِيْنَ نَارًا اَخَاطُ بِهٖ" ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے اس کی قناتیں ان کو گھیرے ہوں گی) میں بھی "اَخَاطُ" کا یہی مفہوم ہے۔ آیت

کا مطلب یہ ہوگا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا اور خوب دل کھول کر گناہ کئے اور توبہ کے بغیر اسی حالت میں مر گیا تو ایسے لوگ اہل جہنم ہیں، انھیں اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ ابورزیں، اعمش، سدیی، ضحاک اور ریح بن خثیم رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ "أَخَاطَتْ بِهٖ خَطِيئَتُهُمْ" کا مطلب ہے کہ اپنے اسی گناہ پر مر گیا اور توبہ نہیں کی ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یعنی اس کی اچھائی کے مقابلہ میں اس کا کفر اس پر محیط رہا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "خَطِيئَتُهُ" سے مراد وہ گناہ ہیں جس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اس کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے گناہ کبیرہ اس کی تفسیر منقول ہے کسی نے حسن رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ "خَطِيئَتُهُ" کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہر بات جسے اللہ تعالیٰ جہنم کی وعید کی ہے "خَطِيئَتُهُ" ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مراد شریک ہے۔ "وَقَدْ أَهْلَكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" یعنی جن لوگوں نے برائی اختیار کی اور ان کے گناہ نے انھیں گھیرے رکھا تو یہ لوگ اہل جہنم ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے "أَصْحَابُ النَّارِ" (اہل جہنم) بنایا، کیونکہ جس طرح کسی شخص کا دوست، ساتھی (صاحب) اور دوسروں کی صحبت کے مقابلہ میں اپنے ساتھی کی صحبت اور اس کی ہنشینی کو ترجیح دیتا ہے، اور اس کے ساتھی کی حیثیت سے لوگوں میں جانا پہچانا جاتا ہے اسی طرح ان لوگوں نے بھی جنت کے مقابلہ میں جہنم کے اعمال کو ترجیح دی، اس لئے یہ لوگ بھی "أَصْحَابُ النَّارِ" (جہنم کے ساتھی) ہوئے اور انھیں بھی اسی نام سے متعارف ہونا چاہیے۔ "وَقَدْ أَهْلَكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" یعنی وہ لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کی قیام گاہ ہوگی۔ ابن عباس اور سدیی رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے۔ "وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" والذین آمنوا یعنی جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی تصدیق کی "وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" اور اللہ کی اطاعت کی، اس کے حدود کو قائم رکھا، اس کے فرائض ادا کئے اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کیا "وَأُولَٰئِكَ" یعنی پس جن لوگوں کے یہ اوصاف ہیں "أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" وہی لوگ اہل جنت ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے وہی ان کی ہمیشہ کے لئے قیام گاہ ہوگی۔ یہ اور اس سے پہلے کی آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اطلاع ہے کہ جنت اور جہنم اور اس میں جو لوگ کھینچے جائیں گے وہ سب ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی فنا نہیں ہونا ہے۔ ان آیات میں یہود کے اس دعویٰ کو رد کیا گیا ہے کہ وہ جنت میں صرف چند دنوں کے لئے ڈالے جائیں گے اور پھر اس کے بعد انہیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں متنبہ کیا کہ اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے تو جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہوگا، اس سے وہ کبھی نہیں نکل سکتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ (اسے بنی اسرائیل) جو لوگ ان چیزوں پر ایمان لائے جس کا تم نے کفر کیا اور وہ کام کئے جنہیں تم نے چھوڑ دیا تھا تو انہیں جنت ملے گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

اور وہ زمانہ یاد کرو جب بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا کسی کی بجز اللہ تعالیٰ کے اور ماں باپ کی ریحی طرح خدمت گزاری کرنا اور اہل قرابت کو

وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ

بھی اور بے باپ بچوں کی بھی اور غریب محتاجوں کی بھی اور عاقل لوگوں سے بات اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا اور باہندی رکھنا نماز کی اور ادا کرنے رہنا زکوٰۃ پھر تم رقول وقول

وَأْتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ○

کر کے) اُس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اترار کر کے ہٹ جانا۔

توحید اور عمل صالح کا عہد

"وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ" ميثاق کا مفہوم عہد ہے بیان کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اسے یہودیوں! وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے

تم سے عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح آیت کا مفہوم منقول ہے علماء قرأت کے اس سلسلے میں اقبال مختلف ہیں کہ آیت میں ”لَا تَعْبُدُونَ“ تاکہ ساتھ ہے یا ”لَا يُعْبَدُونَ“ یا کے ساتھ ہے۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے اور میری رائے میں دونوں طرح قرأت جائز ہے۔ بصرہ کے بعض مٹویوں نے کہا ہے کہ آیت میں واقعہ کی نقل و حکایت ہوئی ہے جیسے کہ ”رَأَيْتُمْ لِقْنَا هُمْ لَا تَعْبُدُونَ“ یعنی ہم نے ان سے کہا کہ خدا کو گواہ بنا کر کہو کہ تم عبادت نہیں کرو گے۔ اسی طرح آیت میں بھی عہد لینے کے واقعہ کو نقل کیا گیا ہے۔ یہ تفسیر ہماری بیان کردہ تفسیر سے قریب ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ خالص اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کریں گے۔ ربیع اور ابن جریر رحمہما اللہ سے اسی کے مطابق تفسیر منقول ہے۔ ”وَيَا نَوَافِلَ الَّذِينَ أَحْسَنَّا“ اس سے پہلی آیت میں ”لَا تَعْبُدُونَ“ سے پہلے قاعدہ کے مطابق ”أَنْ“ محذوف تھا اور ”وَيَا نَوَافِلَ الَّذِينَ أَحْسَنَّا“ کا اس پر عطف ہے۔ مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنے کا، اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا۔ ”أَحْسَنَّا“ کو نصب ایک فعل کی وجہ سے ہے جو عبادت میں مفرد ہے، چونکہ ”بِالْوَالِدِينَ“ سے اس فعل کا مفہوم خود سمجھ میں آجاتا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اصل عبارت اس طرح ہوتی ”يَا نَوَافِلَ الَّذِينَ أَحْسَنَّا“ اس کے علاوہ تقدیر کلام دوسرے طریقوں سے بھی بیان کی گئی ہے۔ ”أَحْسَنًا“ جس کا بنی اسرائیل کو والدین کے ساتھ کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، ان کے لئے اچھی بات زبان سے نکالی جائے، ان کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے، ان کی والداری کا پورا خیال ہو، ان کے ساتھ ہر معاملہ میں نرمی اور لچک ہو ان کے لئے دعائے خیر کی جاتی رہے اور اس کے علاوہ جتنی بھی اس ذیل کی مناسب چیزیں ہو سکتی ہیں اور جن کے اختیار کرنے کو اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ قرار دیا ہے ان سب کا مظاہرہ ان کے لئے کیا جائے۔ ”ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ“ (اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے) (بھی حسن سلوک سے پیش آنے کا) ”ذِي الْقُرْبَىٰ“ یعنی جو رشتہ دار ہیں ان کی قرابت کا حق ادا کیا جائے اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا جائے۔ ”قُرْبَىٰ“ فعلی کے وزن پر مصدر ہے۔ ”الْيَتَامَىٰ“ یتیم کی جمع ہے جیسے اسیر کی جمع آساری آتی ہے۔ اس میں بچے پیمیاں سب آجاتی ہیں۔ یعنی ہم نے یتیموں کے ساتھ بھی نہیں رحمت و شفقت کے معاملہ کا حکم دیا تھا۔ ”وَالْمَسَاكِينِ“ یعنی ہم نے نہیں اس کا بھی حکم دیا تھا کہ مسکینوں کا جو حق اللہ تعالیٰ نے تمہارے مال میں فردری قرار دیا ہے وہ تم ادا کرتے رہو گے۔ یہ ”مسکین“ کی جمع ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو فاقہ اور ضرورت کی وجہ سے جھکا ہوا ہو۔ ”مَفْعِيلٌ“ کے وزن پر ”مَسْكِنَةٌ“ سے نکلا ہے۔ ”ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ“ اور اس کا عہد لیا تھا کہ لوگوں سے بھلی بات کہنا، اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مذکورہ بالا تمام اچھی عادات کے ساتھ انہیں اس کا بھی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ عام لوگوں سے بھی بھلی بات کہیں، یعنی جو لوگ کلمہ تو حید کا اقرار نہیں کرتے اور اس سے اعراض کرتے ہیں انہیں اس کی طرف رغبت و لائیں، حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھلی بات اور نرم گفتگو بھی سائنس کی ہے، عمدہ اخلاق کا مظہر ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ”لوگوں سے بھلی بات کہو“۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں سچی بات کہو“ اس کا انہیں حکم ہوا تھا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نیک کاموں کی طرف لوگوں کو رغبت دلانے اور برے کاموں سے روکنے کے لئے اس آیت میں کہا گیا ہے عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس سے بھلی بات مراد ہے۔ ”وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ“ یعنی نماز کے سلسلے میں جو حقوق تم پر واجب ہیں ان سب کی رعایت کے ساتھ اسے ادا کرنا۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”اقامت صلوات“ یہ ہے کہ نماز میں رکوع سجدہ، تلاوت کلام اللہ، خشوع اور اللہ تعالیٰ کی طرف پوری توجہ کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ ”وَأَوْذُوا بِكَافَّةٍ“ (اور زکاة دیتے رہنا) ”زکاة“ کا مفہوم اس سے پہلے گذر چکا ہے جس زکاة کا بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے اس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد وہ فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو مال پر عائد کیا تھا۔ ان کے یہاں

اس کا طریقہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے مختلف تھا۔ وہ اپنی زکوٰۃ نذر کے طریقہ پر رکھ دیتے تھے، پھر ایک آگ اترتی اور اسے اٹھالے جاتی۔ اس سے یہ سمجھا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا ہے۔ لیکن جس زکوٰۃ کو آگ نہ اٹھالے جاتی وہ غیر مقبول ہوتی تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ آیت میں زکوٰۃ سے مراد اللہ کی طاعت اور اخلاص ہے۔

اس سے کھلی پھر گئے | **وَأَنْتُمْ مَعْرِضُونَ** (پھر بجز معدودے چند کے تم سب ان احکام سے پھر گئے اور تم ہو بھی اعراض کرنے والے) یہ انہیں یہودی بنی اسرائیل کے متعلق اطلاق ہے کہ انہوں نے اس عہد و میثاق کو توڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے لیا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت نہ کریں، والدین کے ساتھ حسن معاشرت اختیار کریں صلہ رحمی کریں، یتیموں کے ساتھ نرم خوئی اختیار کریں، مسکینوں کا حق ادا کریں، اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی ان اعمال کی ترغیب دیں جنکا اللہ نے انہیں حکم دیا ہے، اس کی طاعت و عبادت پر لوگوں کو ابھاریں، نماز کو اس کے حدود کی پوری رعایت کے ساتھ قائم کریں، اس کے فرائض بجالائیں اور اپنے مال کی زکات نکالیں۔ لیکن انہوں نے اس کے ان تمام احکام کے خلاف عمل کیا اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ سے اعراض اور سرکشگی کی، ہاں معدودے چند لوگ ان میں سے اس نافرمانی اور سرکشگی سے بچ گئے اور انہوں نے اللہ کے عہد و میثاق کو پورا کیا، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر منقول ہے، آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو استخفافاً چھوڑا تھا بعض مفسرین کا خیال ہے کہ **وَأَنْتُمْ مَعْرِضُونَ** (اور تم ہو بھی اعراض کرنے والے) سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودی ہیں، اور اس سے پہلے کی تمام آیات سے مراد ان کے اسلاف اور آباء و اجداد ہیں، اس تفسیر کی بنیاد پر **وَأَنْتُمْ مَعْرِضُونَ** کا مطلب تو یہ ہو گا کہ "پھر تمہارے اسلاف نے اعراض کیا، بجز معدودے چند کے" لیکن یہاں بھی ظاہری خطاب انہیں یہودیوں سے ہو رہا ہے جو حضور اکرم کے زمانہ میں موجود تھے اور اس کی وجہ یہی ہے جو ہم اس ذیل کی آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ پھر اس کے بعد حقیقی خطاب حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں سے کیا اور فرمایا کہ اے وہ بنی اسرائیل جو ایسے کردار کے حامل اسلاف کی اولاد ہو، تم بھی انہیں کی طرح اللہ کے عہد و میثاق سے اعراض کرنے والے ہو اور انہیں کی طرح سرکش ہو۔ بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ **وَأَنْتُمْ مَعْرِضُونَ** (پھر بجز معدودے چند کے تم سب ان احکام سے پھر گئے) اور تم ہو بھی اعراض کرنے والے (پوری آیت ان یہودیوں کے بارے میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے ان کی عہد شکنی، معصیت کوشی اور اللہ کے حکم میں تحریف و تبدیلی کی مذمت کی جا رہی ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ رَاسِفُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تَخْرُجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ

اور (وہ) زمانہ بھی یاد کرو اور جب تم سے قول قرار لیا کہ ہاں خونہ زہی مت کرنا اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرنا پھر تمہیں اقرار بھی کر لیا، اور اقرار بھی فہمنا نہیں بلکہ

ثُمَّ أَقْرَدْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ۝ ثُمَّ أَنْتُمْ هُمْ لَا تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَ

ایسا کر جیسے تم شہادت دیتے ہو۔ پھر اس صریح اقرار کے بعد تم جیسے ہوا یہ آنکھوں کو سامنے موجود ہے (پورے کلمہ میں تہمتیں و تہماتیں ہیں) کہ

تَخْرُجُونَ فِرْيَاقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدَاوَانِ ط

ہوا ایک دوسرے کو ترک وطن بھی کرتے ہو ان اپنیوں کے مقابلہ میں (راہی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو گناہ اور ظلم کے ساتھ

وَإِنْ يَأْتُواكُمْ لِسُلْطَانٍ ثَقِيلٍ فَدَفَعُوا لَهُمْ مَا كَفَرُوا بِهِ وَلَا يَمْنُونَ بِلِلَّهِ عِلْمٍ

اور اگر ان لوگوں میں کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسے کو کچھ خرچ کر کے رہا کر دیتے ہو حالانکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ تم کو ان کا ترک وطن کر دینا نیز ممنوع ہے

بَعْضُ الْكُذِبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ

کیا تو ایسے لوگ کہو کہ کتاب تو ریت کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے سوا در کیا سزا ہوئی جائے گی جو تم لوگوں کو ایسی حرکت کرے جو اس کے کہ (سوائے نبوی

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّ وَنَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

زندگانی میں اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دئے جاویں اور اللہ تعالیٰ دیکھے بغیر نہیں ہیں تمہارے

عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَشْرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَحْفَظُهُمْ

اعمال سے یہ اور وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے احکام کی مخالفت کر کے دنیوی زندگی کو (مخلوط کر لیا) دنیوی دنیا کی بجائے آخرت کے سوز و غم کو (مخلوط کر لیا) انکی سزا میں کچھ تخفیف دی

الْعَذَابُ وَكَانَ يُنصِرُونَ ۝

جا رہے گی اور نہ کوئی ان کی طرف داری و سپردی کہنے باوے گا۔

ایک اور عہد اور اس کی خلافت ورزی

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تَحْرِجُونَ الْأَنْفُسَ

اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تَحْرِجُونَ الْأَنْفُسَ مِنْ دِيَارِكُمْ (اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنی جانوں کا خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے نہ نکالنا) ميثاق سے "وَأَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ" مفہوم اور اعتراب ہر حیثیت سے "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ" کا معنی ہے "سفک دم" ایسے خون بہانا جو نہ لیا جائے۔ آیت میں انہیں آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے کی عاقبت سے متعلق عہد کا ذکر ہے، انہیں اس سے روکا گیا تھا کہ خود ہی اپنے آدمی کو قتل نہ کریں، کیونکہ اپنے ہی مذہب اور اپنے ہی دین کے آدمی کو قتل کرنا خود سے اپنی جان لینے کے مترادف تھا کہ جب دونوں کا مذہب ایک تھا تو گویا وہ ایک جسم اور ایک فرد کی طرح تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان آپس میں رحم اور نرمی کا معاملہ اختیار کرنے میں ایک جسم کی طرح ہیں جس کے کسی بھی حصہ میں اگر تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، اس آیت کا یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ تم اپنے ہی مذہب و ملت کے آدمی کو قتل نہ کرو کہ اس کے بدلہ میں قصاص کے طور پر تمہیں بھی قتل کیا جائے گا اور اس طرح گویا تم نے اسے قتل کر کے خود اپنی جان ضائع کر لی۔ قتادہ اور ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہما نے آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ تم نے تم سے اس کا عہد لیا تھا کہ "بِأَنَّكُمْ تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تَحْرِجُونَ الْأَنْفُسَ مِنْ دِيَارِكُمْ" یعنی پھر تم نے اس مذکورہ بالا عہد ميثاق کا اقرار کیا۔ ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے۔ "وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ" (اور تم گواہ ہو) اس کی تفسیر میں ائمہ مفسرین کے کئی اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ خطاب ان یہودیوں سے براہ راست ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرتا ہے کہ تو ریت تمہارے پاس موجود ہے تمہارے اسلاف نے اس عہد کا اقرار کیا تھا کہ اپنے ہی لوگوں کا خون نہیں بہانا ہے اور اپنے ہی ملت والوں کو اپنے وطن سے نہیں نکالنا ہے اور تم ان کے اس اقرار پر گواہ ہو، لیکن پھر بھی تم تو ریت کے ان احکام کو ضائع کر رہے ہو اور ان کی خلافت ورزی کرتے ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مفہوم نقل ہوا ہے، لیکن ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ "وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ" بھی حضور اکرم کے زمانہ کے یہودیوں کے اسلاف کے متعلق نہیں ہے، مفہوم ہے، "وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ" (یعنی اس واقعہ کے وقت تم وہاں موجود تھے) جس طرح کھیلی آیات میں ان کے اسلاف کے واقعات کو بیان کرتے وقت خطاب انہیں یہودیوں سے کیا گیا ہے وہی صورت یہاں بھی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک بہتر تفسیر یہ ہے کہ مدد و انتم تَشْهَدُونَ میں غیر تو ان کے اسلاف ہی کی ہو لیکن حضور اکرم کے زمانہ کے یہودی بھی اس میں شامل ہوں جس سے قرآن مجید براہ راست خطاب ہے۔ "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ" (اور جب ہم نے تم سے عہد لیا) میں بھی یہی صورت ہے، کیونکہ اگرچہ اللہ تعالیٰ

نے براہ راست عہد تو انھیں بنی اسرائیل سے لیا تھا جو رسول اللہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے لیکن تورات کے حکم کے مطابق اس عہد پر عمل اس کے بعد آنے والے ہر زمانہ کے یہودیوں کے لئے ضروری تھا چہرہ تم اکتوزد تم و انتم تشہد و ن سے یہودیوں کو جو ان آیات کے براہ راست مخاطب ہیں انکی اور ان کے اسلام کی عہد شکنی پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جس عہد پر عمل تمہارے لئے ضروری تھا تم نے اسے توڑا اور اس کے خلاف عمل کیا، اصل میں جس عہد و میناق کا ذکر چل رہا ہے اس پر عمل جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے یہودیوں پر ضروری تھا اسی طرح آپ کے بعد آنے والے ہر زمانہ کے یہودیوں کے لئے اس پر عمل ضروری تھا، اللہ تعالیٰ نے آیت میں یہودیوں کے کسی خاص طبقہ کی تخصیص نہیں کی ہے بلکہ اس میں اس کی گنجائش ہے کہ ہر زمانہ کے یہودی اس سے مراد لئے جائیں، اس لئے مناسب نہیں ہے کہ آیت میں جو حکم عام ہے اسے بلا کسی دلیل کے کسی قسم کی تخصیص کی جائے اور کہا جائے کہ ان کاٹلاں طبقہ مراد ہے اور فلاں مراد نہیں ہے۔ اس کے بعد جو آیت آرہی ہے اس میں بھی یہی صورت ہے۔

”ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُحْرَجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَطَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِآيَةٍ وَآيَةٍ“

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنیوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے وطن سے کال بھی دیتے ہو، ان کے مقابلہ میں گناہ اور ظلم کے ساتھ ان کے مخالفین کی مدد بھی کرتے ہو۔ ”ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ“ کی تفسیر دو طرح ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ اصل میں آیت یوں تھی ”ثُمَّ أَنْتُمْ يَا هَٰؤُلَاءِ“ یعنی پھر تم اسے یہودیوں کو یا آیت میں ”یا“ (اسے) حذف ہو گا۔ قرآن مجید ہی میں ایک موقع پر ”يُؤَسِّفُ أَعْرَضَ عَنْ هَٰذَا“ میں یہی صورت ہے، اصل میں یوں ہے ”يَأْيُؤَسِّفُ أَعْرَضَ عَنْ هَٰذَا“ (اسے یوسف! اس سے اعراض کیجئے) دوسری تفسیر یہ ہے کہ اصل عبارت یوں تھی ”ثُمَّ أَنْتُمْ قَوْمٌ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ“ (پھر تم ہی وہ قوم ہو کہ اپنیوں کو قتل کرتے ہو) ”تطاهروں“ (جس سے تطاہر و نکلنا ہے) کے معنی تواون کے ہیں، کیونکہ تواون میں بھی ایک کو دوسرے کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے (للقویۃ بعضهم ظہر بعض)

”وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ“ کی تفسیر میں جس طرح مختلف اقوال تھے زیر تفسیر آیت میں بھی اسی کے مطابق اقوال کا اختلاف ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”تم اپنیوں کے مقابلہ میں ظلم گناہ کے ساتھ مشرکین کی مدد کرتے ہو۔ اور اس طرح مشرکین کے ساتھ ملکر اپنیوں کا خون بہاتے ہو اور انھیں ان کے وطن سے نکالتے ہو۔ آپ نے بیان فرمایا کہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے ناحق اپنے امیوں کا خون بہانا ان پر حرام کیا تھا، اور ان پر فرض کیا تھا کہ اگر کوئی ان کا ہم مذہب قیدی ہو جائے تو فدیہ دیکر اسے چھڑائیں۔ یہی میں ان کی دو جماعتیں ہو گئی تھیں بنو قینقاع کے یہودی مشرکین مدینہ کے قیدی خنزرج کے حلیف تھے اور بنو نضیر اور بنو قریظہ کے یہودی قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ جب کبھی مدینہ کے ان دونوں قبیلوں میں جنگ ہوتی تو اپنے معاہدہ کے مطابق بنو قینقاع، قبیلہ خنزرج کا ساتھ دیتے اور بنو نضیر اور قریظہ قبیلہ اوس کا ساتھ دیتے اور اس طرح اپنے ہی ہم مذہبوں اور بھائیوں کے خلاف اپنے حلیفوں کی مدد کرتے اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بھائیوں کو قتل کرتے، حالانکہ تورات ان کے پاس موجود تھی اس کے احکام، حلال و حرام سے یہ خوب واقف تھے۔ یہاں قبیلہ اوس و خنزرج کا معاملہ تو یہ تو مشرک تھے، بنوں کی پستش کرتے تھے، نہ جنت سے واقف تھے اور نہ جہنم سے۔ بخت، قیامت، کتاب اور حلال و حرام کا ان کے یہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا، لیکن یہودی تو ان سب چیزوں سے واقف تھے اور اہل کتاب ہونے کے دعویدار تھے۔ پھر جب جنگ بند ہو جاتی تو ان کے حلیفوں کے ہاتھ میں ان کے ہم مذہب مخالفوں میں سے جو جنگی قیدی لگتے۔ انھیں اپنے پاس سے فدیہ دیکر چھڑا لیتے اور کہتے کہ تورات میں یہی حکم ہے، حالانکہ تورات میں اس کا بھی حکم تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کو ناحق قتل نہ کریں، لیکن وہ ایک حکم پر عمل کرتے تھے اور دوسرے حکم کو چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ ”کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو تو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو؟ یعنی اپنے ہم مذہبوں کو فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو اور کہتے ہو کہ تورات میں یہی حکم ہے، ٹھیک ہے، تورات میں واقعی یہی حکم ہے، لیکن اسی میں اس کا بھی حکم ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، تم اس پر کیوں عمل نہیں کرتے کیا تم

اس حکم سے انکار ہے؛ جہاں تک مجھے علم ہے اس و خزر ج کے ساتھ ملکر ان کے اسی طرز عمل کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ شہداء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آیت کا یہی شان نزول ذکر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے تورات کے ذریعہ یہ ضروری قرار دیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور بنی اسرائیل کا جو فرد بھی غلام یا باندی کی حیثیت سے انھیں ملے اسے فوراً خرید کر آزاد کریں، لیکن وہ اپنے حلیفوں کا ساتھ دیتے وقت لڑائی میں اپنے مخالف یہودیوں کو قتل کرتے تھے۔ پھر جب جنگی قیدی لائے جلتے تو سب بچاتے اور فدیہ دے کر یہودی قبیلوں کو آزاد کرا لیتے تھے۔ مشرکین عرب اس پر انھیں شرم دلاتے کہ آپس میں لڑتے ہو اور پھر جب قیدی آتے ہیں تو انہیں چھڑا لیتے ہو۔ یہودی کہتے کہ آپس میں جنگ کرنا ہمارے لئے حرام ہے اور قیدیوں کو چھڑانا فرض ہے، اس لئے ہم اپنے یہودی قیدیوں کو چھڑاتے ہیں، عرب کہتے کہ پھر جنگ ہی کیوں کرتے ہو؟ اس کا جواب ان کے پاس یہ تھا کہ ہمیں غیرت آتی ہے کہ ہمارے حلیف کمزور پڑ جائیں اور انھیں جنگ میں شکست اٹھانی پڑے۔ اسی دور خنہ بن پر اللہ تعالیٰ نے آیات میں انھیں شرم دلانی ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ لیکن ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ روش تھی کہ جب کوئی قبیلہ ان کے یہاں کمزور پڑ جاتا تو اسے جلا وطن کر دیتے تھے حالانکہ ان سے عہد لیا گیا تھا کہ خون نہ بہائیں گے اور کسی کو اس کے وطن سے نہ ہٹائیں گے۔

”عَدُوٌّ اَنْ فَعَلْنَا“ کے وزن پر ”تَعَلَّوْا“ سے نکلا ہے، ظلم اور سرکشی میں کوئی اگر حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے

لئے بولتے ہیں۔

”وَ اِنْ يَأْتُوْكُمْ اَسَارٰى فَاَنْفِقُوْهُم مِّنْ اَمْوَالِكُمْ وَ هُوَ مَحْرَمٌ عَلَيْكُمْ اِذَا جَمَعْتُمْ اَفْتُوْا مِنْهُمْ مِّنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ“ (اور اگر وہ تم تک قیدی ہو کر پہنچتے ہیں تو تم انھیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کا وطن سے نکالنا ہی تم پر حرام تھا، تو کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو) یعنی تم خوب جانتے ہو کہ جو تم نے عہد کیا تھا اس کے کسی حصہ سے بھی انکار اس عہد و میثاق کو توڑنا ہے جو تم نے مجھ سے کیا تھا، جس طرح تمہارا مجھ سے یہ عہد تھا کہ اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑا لو گے اسی طرح تم نے یہ بھی عہد کیا تھا کہ آپس میں ناحق ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنے ہی آدمیوں کو اپنے وطن سے نہ نکالو گے، لیکن تم ایک پر تو عمل کرتے ہو اور ایک دوسرے حکم کو نظر انداز کر دیتے ہو، حالانکہ فرض ہونے کی حیثیت سے تمہارے لئے دونوں ہی حکم برابر تھے اور قتل اور جلا وطن کرنا بھی تم پر حرام تھا۔ اللہ کے احکام میں تم اپنی طرف سے فرق آخر کس بنیاد پر کرتے ہو؟ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کا اپنے آدمیوں کو ان کے وطن سے بے وطن کرنا کفر تھا اور اپنے قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں آزاد کر لینا ایمان تھا (جس کا آیت میں ذکر ہوا ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی ”اَفْتُوْا مِنْهُمْ مِّنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُوْنَ“ کی تفسیر یہی منقول ہے۔ ابن جریر، جہاد اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی روایت ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (جو ایمان لانے سے پہلے بنی اسرائیل کے بہت بڑے عالم مانے جلتے تھے) کو فہم میں جا لوت کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ یہودیوں کی انھیں قیدی عورتوں کا فدیہ دیکر انھیں چھڑا رہا تھا جن کے ساتھ عربوں نے ہم بستری نہیں کی تھی، لیکن جن کے ساتھ (باندی ہونے کے حق کی وجہ سے) ہم بستری کر لی تھی، انھیں آزاد نہیں کرا رہا تھا، اس پر آپ نے فرمایا کہ تمہاری کتاب (توریت) میں تو یہ لکھا ہے کہ اپنے تمام قیدیوں کو فدیہ دیکر چھڑاؤ (اور تم صرف ایک خاص طبقہ کو آزاد کرا رہے ہو) یہ روایت میرے علم میں آئی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بنی اسرائیل کے اس واقعہ کے ضمن میں فرمایا کہ بنی اسرائیل تو گزر چکے، اب اس آیت کے مصداق تم ہو!

۱۵ یعنی اگر تم بھی انھیں کی طرح کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کے بعض احکام پر عمل کرو گے اور بعض احکام کو نظر انداز کر دو گے تو تم میں اور یہودیوں میں پھر فرق کیا باقی رہ جائے گا؟ یہودیوں کو تو جو کچھ کرنا تھا وہ کر گئے اب وہی روش تمہاری نہ ہونی چاہئے۔ (مترجم)

”فَأَجْزَاءٌ مِّنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ حِرَاقَةَ خُرُومٍ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ یعنی تم میں سے جو لوگ ایسا کرتے ہیں کہ آپس میں قتل و قتال کر کے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں اور ظلم و گناہ پر اس درجہ جری ہو گئے ہیں کہ مشرکوں کی حمایت کے جذبہ میں اپنے ہی آدمیوں کو جلا وطن کر دیتے ہیں اس کی سزا دنیوی زندگی میں ذلت و رسوائی سے کم اور کیا ہو سکتی ہے؟ ”جزاء“ بمعنی بدلہ، ثواب یا سزا۔ ”خُرُومٍ“ بمعنی ذلت و حقارت۔ ”فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا“ یعنی اس دنیا میں، آخرت سے پہلے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ یہودیوں میں سے جو بھی کسی کو قتل کرے تو اسے پکڑو اور مقتول کی فضا ص میں اسے قتل کر دیا جائے اور ظالم سے مظلوم پر ظلم کا بدلہ لیا جائے، یہودیوں پر یہی ذلت کا عذاب تھا جس کی طرف اشارہ آیت کا لفظ ”خُرُومٍ“ (ذلت و رسوائی) کر رہا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد جزیرہ (لگان) ہے جو ان یہودیوں سے لیا جاتا ہے گا جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اسلامی سلطنت کے حدود میں بود و باش اختیار کریں گے۔ دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ جس ”ذلت“ کا انھیں دنیاوی زندگی میں منہ دیکھنا پڑا وہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے نکال دیا تھا اور دوسرے قبیلہ بنو قریظہ کے تمام جنگ کے قابل افراد کو قتل کر دیا تھا اور ان کے عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیا تھا، دنیاوی زندگی میں ان کی یہی ذلت تھی اور آخرت میں انھیں ان کے اعمال پر عذاب عظیم ہو گا۔ ”وَكُوفُومُ الْقِيَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ یعنی انکی نافرمانی کے نتیجہ میں دنیاوی زندگی میں انھیں ذلت و رسوائی ملی ہے اور اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد جب قیامت قائم ہوگی تو انھیں اس دنیا سے بھی زیادہ سخت عذاب میں ڈالا جائے گا۔

”وَمَا لَكُمْ بِمَا فَعَلْتُمْ كُفْرًا“ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے، بعض علماء قرأت نے رعاع فعلوں کے بجائے ”عَمَّا تَعْمَلُونَ“ (اور جو کچھ وہ کرتے ہیں) پڑھا ہے۔ صحیح دونوں قرأتیں ہیں، لیکن میرے نزدیک بہتر یہی دوسری قرأت ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس سے متصل آیت میں غائب ہی کا صیغہ یہودیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ شرع سے خطاب کا صیغہ استنوال ہوتا چلا آ رہا ہے لیکن زیر تفسیر آیت سے متصل آیت میں غائب کا صیغہ ہے اور بہتر ہے کہ مفہوم کی آسانی کے لئے یہ بھی غائب ہی رہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ان بدترین اور قابل نفرت اعمال سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہے۔ اس کے یہاں تمہاری تمام بد اعمالیاں محفوظ ہیں اور اس دنیا کی رسوائی اور ذلت کے بعد آخرت میں بھی تمہیں اس پر عذاب ہو گا۔

”أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ“ (یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی خرید لی ہے آخرت کے بدلہ میں، ان پر نہ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مدد دی پہنچے گی) انہیں لوگوں کے متعلق ارشاد ہے جو کتاب الہی کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، یعنی اپنے ہم قوم و ہم مذہب قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں تو آزاد کر لیتے ہیں، لیکن آپس میں قتل و قتال سے باز نہیں آتے اور موقع ملتا ہے تو جلا وطن کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کے متعلق فرماتا ہے کہ انہوں نے اپنے جاہل، بے وقوف اور کمزور ہم مذہبوں پر اقتدار اور ان پر ریاست کو خرید لیا ہے اور آخرت کے بدلہ میں دنیا کی حقیر اور معمولی زندگی کو ترجیح دی ہے، خریدنے کے ساتھ اس کی تفسیر اس لئے کی گئی کہ اللہ کا کفر کر کے وہ دنیاوی زندگی سے راضی اور خوش تھے اور آخرت کی زندگی اور اللہ پر ایمان کے مقابلہ میں اسے اختیار کئے ہوئے تھے اور خرید و فروخت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ آدمی قیمت دیکر کوئی ایسی چیز لیتا ہے جو اس کے لئے وقتی طور پر زیادہ مناسب اور بہتر ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے کبھی یہی تفسیر منقول ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انہوں نے اس طرح کی خرید و فروخت کی اور آخرت پر ایمان کے مقابلہ میں معمولی دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تو یقیناً آخرت کے آرام و آسائش میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ بلکہ اس کے بدلہ میں انھیں عذاب ہو گا اور ان کے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا، کیونکہ عذاب تو اسی شخص سے ہلکا کیا جاسکتا ہے جس کا جنت اور آخرت کی نعمتوں میں بھی کوئی حصہ نہ ہو اور انہوں نے اپنے آپ کو بالکل تہی دامن رکھا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کتاب (توریت) دی اور پھر ان کے بعد درمیان میں کئی دیگر نبیوں کو بھی کتاب (انجیل) دی اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو

مَرْيَمَ الْبَتُولَ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا

زینت کے) واضح دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کو روح القدس سے تائید دی تو کیا جب کبھی بھی کوئی پیغمبر آپس میں ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل

تَقْوَى الْفُسْكَمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَمِرْ قَاتِلُوا قَتُلُوا قَتُلُوا

نہ پارتا تھا جب ہی تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا سو بعضوں کو تو تمہارا نبی (جھوٹا بتلایا) اور بعضوں کو (بیدھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

کتاب الہی، بیانات اور روح القدس [وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ] اور ہم نے موسیٰ پر کتاب نازل کی اور ان کے پیچھے
پے در پے پہنچے پیغمبر بھیجے "آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ" یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل کی، کتاب سے مراد توریت ہے۔ "وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ"
یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے در پے مسلسل پیغمبر بھیجے۔ "وَقَفَّيْنَا" کی اصل "قَفَّأ" (کھوپڑی) ہے، بولتے ہیں۔ "قَفَّوْتُ قَفَاؤًا" یعنی میں اس
کے پیچھے پیچھے چلا۔ "مِنْ بَعْدِهِ" یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد، اور "بِالرُّسُلِ" سے مراد انبیاء ہیں، رسول کی جمع ہے۔ واحد (ایک)
کے لئے "رسول" اور جمع (دو سے زیادہ کے لئے) "رُسُلٌ" استعمال ہوتا ہے۔ اسی وزن پر "صدیق اور صبر، شکور اور شکر
علی الترتیب واحد اور جمع کے لئے ہے۔ "وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ" کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پے در پے ایک ہی شریعت اور ایک ہی راستہ
دکھانے کے لئے انبیاء بھیجے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی انبیاء بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ان میں سے
کسی پر کوئی نئی شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں نازل ہوئی، بلکہ سب اسی شریعت کو قائم کرنے کے لئے نازل ہوتے رہے جو
موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نازل کی تھی اور سب نے توریت ہی پر عمل کی طرف اپنے وقت کے اسرائیلیوں کو بلایا اس لئے فرمایا
کہ "وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ" یعنی موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت اور انھیں کے طریقہ کی طرف بلانے کے لئے ہم نے پے در پے انبیاء
ان کے پاس بھیجے۔

"وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ" (اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے) "بِیَدْنَاهُ" سے مراد وہ مافوق الفطرت
چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ان کی نبوت کی دلیل و حجت کے طور پر ظاہر کی تھیں، جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور زرا
تائینا کو آنکھ والا بنادینا اور اس کے علاوہ بہت سے معجزات جو آپ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوئے تھے اور اس پر دالت کرتے تھے کہ آپ کی نبوت
کا دعویٰ حق اور صحیح ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ مراد آپ کے وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق
کے لئے آپ کے ہاتھ سے ظاہر کئے تھے، جیسے مردوں کو زندہ کر دینا، مٹی سے پرندہ کی شکل کا بنانا اور اس میں پھونک مارنا جس سے وہ مٹی
اللہ کے حکم سے جاندار پرندہ بن جاتی تھی، مریضوں کو شفا بخشنا اور بہت سے ان کے پوشیدہ احوال کی اطلاع دے دینا کہ وہ کیا چیزیں
اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں وغیرہ۔ "وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ" (اور ہم نے روح القدس کے ذریعہ ان کی مدد کی)۔
"أَيَّدْنَاهُ" یعنی ہم نے ان کی مدد کی، ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہے۔ بولتے ہیں "أَيَّدَكَ اللَّهُ" یعنی اللہ تمہیں قوت دے،
تمہاری مدد کرے "مَجَّلْنَا ذُو أَيْدٍ" قوت والا آدمی "مِنْ رُوحِ الْقُدُسِ" کے سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ اس سے کیا مراد ہے؟ بعض
مفسرین نے فرمایا کہ "روح القدس" سے مراد مشہور و معروف فرشتہ جبریل علیہ السلام ہیں جنکے منعلق اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی
ہے کہ ان کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام کی مدد و تائید کی جاتی تھی، یہ قول قتادہ، سدی، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ سے منقول ہے۔ بشیر
بن جوشب اشعری سے روایت ہے کہ چند یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ ہیں "روح القدس" کے متعلق بتائی

کہ وہ کون ہیں؟ آنحضرت نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کی اور اس کے نبی اسرائیل پر انعامات اور سزاؤں کی قسم دیتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ جبریل ہیں اور وہ میرے پاس آتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ہمیں معلوم ہے۔ دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد ”انجیل“ ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”أَيُّهَا كَاهِنُ بَرُوحِ الْقُدُسِ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کے ذریعہ مدد کی تھی، جو ”روح“ تھی۔ اسی طرح قرآن مجید کو بھی اللہ تعالیٰ نے ”روح“ بنا یا، دونوں اللہ کی روح ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید کے متعلق ارشاد ہے کہ ”وَكُنَّا إِلَهُكُمْ وَمَا كُنَّا آتِينَكُمْ“ اور اسی طرح ہم نے آپ کے پاس روحِ روحی (یعنی اپنا حکم بھیجا ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں نقل ہوا کہ ”روح القدس“ وہ ”اسم“ (اللہ تعالیٰ کا نام) ہے جس کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ اس کی تفسیر میں تیسرا قول ہے۔ میرے نزدیک ان تمام اقوال میں صحیح قول یہ ہے کہ ”روح القدس“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود ایک موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ ”وہ وقت یاد میں رکھو جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اور اپنی والدہ کے اور یاد کرو، جبکہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطے سے کی تھی، تم آدمیوں سے کلام ان کی گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی، اور جبکہ میں نے تمہیں کتاب و حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی“ ”روح القدس“ جس سے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کی تھی، اگر اس سے مراد انجیل ہوتی تو پھر آیت میں ”جب میں نے آپ کی مدد کی روح القدس کے ذریعہ“ اور اسی کے ساتھ ”اور جب میں نے آپ کو کتاب و حکمت، تورات اور انجیل سکھائی“، دو ہم معنی آیتیں ہو جائیں گی کیونکہ روح القدس کا ترجمہ انجیل کرنے کے بعد آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”جب میں نے آپ کی انجیل کے ذریعہ تائید کی اور جب میں نے آپ کو انجیل سکھائی“ ظاہر ہے کہ انجیل کے ذریعہ آپ کی تائید اسی وقت ممکن ہے جب پہلے آپ نے اسے سکھ لیا ہوگا، پس آیت میں ایک ہی مضمون کو بغیر کسی ضرورت کے دہرانا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا ایک ایک حرف ہزاروں فائدے رکھتا ہے، وہ ذات اس سے بلند و برتر ہے کہ اس کا کوئی کلام فائدہ سے خالی ہو، اور یہاں ”روح القدس“ سے انجیل مراد لینے میں اسی قسم کا نکرار کلام لازم آتا ہے جو غیر مفید ہے۔ اگرچہ یہ بھی حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اپنے انبیاء پر نازل کیں وہ سب اس کی طرف سے ”روح“ تھیں، کیونکہ ان کے ذریعہ مردہ دلوں کو زندگی ملتی تھی اور گمراہ خیالات ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے، لیکن بہر حال آیت میں یہ مراد نہیں ہو سکتا۔

جبریل علیہ السلام کا نام اللہ تعالیٰ نے ”روح“ رکھا اور پھر اس کی اصناف ”قُدُس“ کی طرف کی، کیونکہ آپ کی تخلیق صرف اللہ کے حکم سے، والد و والدہ کے واسطے کے بغیر ہوئی ہے۔ گویا آپ اس کی طرف سے ”روح“ ہیں، اور ”قُدُس“ کے معنی پاک کے آتے ہیں، اس لئے اس کی طرف روح کی اصناف کی۔ اسی مناسب سے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی ”رُوحًا لِلَّهِ“ آیا ہے یعنی اللہ کی طرف سے روح (کیونکہ آپ بھی بغیر والد کے واسطے کے اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے۔ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ”قُدُس“ کے معنی پاک کرنے کے ہیں اور اسی سے ”قُدُس“ پائی کے معنی میں آتا ہے۔ ائمہ تفسیر کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ ”قُدُس“ کا معنی آیت میں کیسا ہے، سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ”قُدُس“ بمعنی برکت ہے۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد خود اپنے متعلق ہے ”يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ“ اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، پاک ہے،

فرمایا کہ ”قُدُّوس“ اور ”قُدُس“ ایک ہی ہیں۔ کتب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی نقل ہے کہ ”قُدُس“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

تم ہمیشہ سے اپنی مرضی چلانے کے عادی ہو
 ”أَفَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُولٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ يَأْتُونَكُم بِالْبَيِّنَاتِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ الَّذِي لَهُ الْبَيِّنَاتُ الَّتِي أَتَىٰ بِهَا لُقْمَانَ رَبِّهِ ثُمَّ كَفَرَ بِهَا فَنَافِلَتْهُ لِقْمَانُ رَبِّهِ كَمَا يَفْعَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ كَفَرُوا“
 پاس ان احکام کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے تو تم اگلے لگے، پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کرنے لگے، اس آیت

بنی اسرائیل کے یہودی ہی مراد ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے اللہ تعالیٰ ان آیات میں ارشاد فرماتا ہے، اے گروہ یہودی بنی اسرائیل! ہم نے تمہاری ہدایت کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی، ان کے بعد پے درپے انبیاء بھیجے اور عیسیٰ علیہ السلام کو جب ہم نے تمہارے پاس بھیجا تو انہیں روشن نشانات اور معجزات عطا کئے اور ان کی روح القدس سے تائید کی، لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ جب بھی تمہارے پاس میرا کوئی نبی آیا اور اس راستہ کی طرف تمہیں ہدایت کرنی چاہی جس کے لئے تمہارا نفس تیار نہیں تھا تو تم نے کبر کا مظاہرہ کیا، نافرمانی اور سرکشی کی، بعض انبیاء کو تو تم نے صرف جھٹلایا ہی تھا، لیکن بعض کو تو قتل بھی کیا۔ میرے انبیاء کے ساتھ تمہارا ہمیشہ سے یہی معاملہ ہے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝

اور وہ یہودی افتخاری کہتے ہیں کہ ہمارے کتب محفوظ ہیں، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں اور جب

جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتُونَ

ان کو ایک ایسی کتاب پہنچی یعنی قرآن جو منجانب لہو ہے اور اس کتاب کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے جو پہلے سے ان کے پاس (یعنی توریت) حالانکہ سکے قبل خود بیان کیا کرتے

عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

تھے کفار سے مگر پھر جب وہ چیز پہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے تھے، اُسکا (ہمارا) انکار کر بیٹھے سو بس (خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر۔

یہ دعویٰ! "وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ" (اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل محفوظ ہیں)۔ "غُلْفٌ" کی دو قرأتیں ہیں مشہور و معروف قرأت تو یہی "غُلْفٌ" ہے جس میں لام ساکن پڑھا جاتا ہے اس قرأت کی بنیاد پر آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پر دوں میں (محفوظ) ہیں، اس وقت یہ لفظ "أَغْلَفٌ" کی جمع ہو گا، اس چیز کو کہتے ہیں جو پردہ اور غلاف میں محفوظ ہو۔ اسی مناسبت سے غیر مختون مرد کو بھی "أَغْلَفٌ" کہتے ہیں اور غیر مختون عورت کے لئے "غُلْفَاءُ" آتا ہے، تلوار (عربی میں اس کے لئے سیف آتا ہے) اگر نیام میں ہو تو اس کے لئے "سَيْفٌ أَغْلَفٌ" بولتے ہیں۔ حدیقہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا، دل چار طرح کے ہوتے ہیں، پھر آپ نے اس کی تفصیل ذکر کی، اور آخر میں فرمایا کہ ایک "قلب اغلف" (وہ دل جو پردہ میں ہو) ہوتا ہے جو معصوب علیہ ہے اور یہ کافر کا دل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر روایت ہے کہ "قُلُوبُنَا غُلْفٌ" یعنی ہمارے دل پردے میں ہیں، ایک روایت میں آپ سے ہے کہ یہ وہ دل ہے جس پر ہر لگ چکی ہے۔ مجاہد، اعمش، قتادہ، ابوالوالیبہ سیدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل پردہ میں (محفوظ) ہیں، اور آپ کی کوئی بات ہم پر اثر نہیں کرتی۔ دوسری قرأت ہے "غُلْفٌ" یعنی لام پر تشدید کے ساتھ پڑھا گیا ہے جن علماء قرأت نے اس طرح پڑھا ہے ان کے نزدیک آیت کی تفسیر یہ ہے کہ "ہمارے دل علم کے ظرف ہیں، گنجینہ علوم ہیں" اس صورت میں یہ "غُلْفٌ"۔

۱۰ عورتوں کا ختنہ ہمارے ملک میں ایک عجیب سی بات ہو گی، لیکن مردوں کی طرح عورتوں کا ختنہ بھی سنت ہے۔ ختنہ کی رسم عربوں میں زمانہ جاہلیت میں بھی تھی۔ یہ ان چند رسموں میں سے ایک ہے جو براہیم علیہ السلام کی سنتوں میں سے عربوں میں صحیح صورت میں باقی تھی۔ چنانچہ اسلام نے اس سنت پر بھی کو باقی رکھا۔ عرب میں اب بھی عورتوں کے ختنہ کے لئے عورتیں ہوتی ہیں۔ اور عورتوں میں بھی یہ رسم اب تک باقی ہے۔ لیکن ہمارے ہندوستان میں اس کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہا ہے۔ (مترجم)

کی جمع ہوگی، اس وزن پر کتاب کی جمع "کُتُبٌ" حجاب کی جمع مُجْتَبٌ وغیرہ آتی ہے۔ آیت کا مطلب اس قرارت کی بنیاد پر یہ ہوا کہ "اور یہود کہتے ہیں کہ ہمارے دل علم کے خزانے اور اس کے ظرف ہیں، عظیمہ رحمتہ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ آپ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا "اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل علوم سے لبریز ہیں ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن ان دونوں قرارتوں میں جائز صرف پہلی ہی قرارت ہے۔

یہ سب التشریح کی لغت کے مظاہر ہیں | اور بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ یعنی بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی اور انہیں اپنی رحمت سے دور اور ذلیل کر رکھا ہے،

کیونکہ وہ کفر کرتے ہیں، اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء کا انکار کرتے ہیں اور معجزات اور نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ "لَعْنٌ" کا حقیقی مفہوم دور کرنا، دھنکا کرنا ہے۔ اسی سے ملعون و لعین آتا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید و تکذیب کی ہے، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارے دل تو پر دے میں محفوظ و مامون ہیں" لفظ "بَلْ" ہمیشہ کلام میں اپنے سے پہلے جملے کی نفی اور اس کی تردید کے لئے آتا ہے۔ یہاں بھی ان کے دعوے کی تردید کی گئی ہے۔

"فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ" اس آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ان میں بجز معدود چند کے کوئی ایمان نہیں لانا" یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ ایک دوسری تفسیر یہ ہے کہ "وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں" اللہ تعالیٰ یہ اطلاق دیتا ہے کہ ان آیات میں جن لوگوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں ان پر اس نے لعنت کی ہے اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو شریعت اس نے نازل کی ہے اس پر ان کا ایمان بہت تھوڑا ہے۔ "فَقَلِيلًا" پر جو نصب ہے اس کی بھی وجہ صرف یہی ہے، کیونکہ یہ ایک محذوف مصدر کی صفت ہے اصل میں یوں تھا، "فَاِيْمَانًا قَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" پس وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی تفسیر میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو قول نقل ہوا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس تفسیر کے صحیح ہونے کے کیلئے ضروری تھا کہ "قَلِيْلًا" کو بجائے نصب کے رفع ہوتا اور عبارت یوں ہوتی "فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" اور "مَا" کے معنی میں ہوتا، اسے نصب پڑھتے ہوئے "مَا" کو مَنْ کے معنی میں لینا جائز نہیں ہے۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ" میں لفظ "مَا" کے معنی کے سلسلے میں علماء لغت کے کئی اقوال نقل ہوئے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ "زانہ" ہے اور اس کا کوئی معنی مراد نہیں اور اصل عبارت یوں ہے۔ "فَقَلِيْلًا يُّؤْمِنُوْنَ" (ما کے ذکر کا فائدہ اس میں صرف قلت پر زور دینا ہے) دو حکم علماء نے کہا کہ "مَا" آیت میں عموم کے لئے آیا ہے۔ اس لفظ کے مفہوم میں ہر چیز آ سکتی ہے ہمارے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ "ایمان" کا معنی "تصدیق کرنا، ماننا" ہے جن یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ اللہ کی وحدانیت بعث اور ثواب و عقاب کو تو مانتے تھے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نبوت کا کفر کرتے تھے، حالانکہ تمام ہی امور پر ایمان ان کے ضروری تھا، موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب الہی تو ریت میں ان سب چیزوں پر ایمان لانا ان پر فرض کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ان میں سے صرف چند چیزوں کو مانا، اور یہی ان کا قلیل اور تھوڑا سا ایمان تھا جس کو آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں جن امور کو انہوں نے جھٹلایا یعنی آنحضرت کی نبوت آپ کی شریعت اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب (تو وہ بہت زیادہ تھی۔ بعض مفسرین نے آپ کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ "وہ کسی بھی چیز پر ایمان نہیں رکھتے" آیت میں اگرچہ یہی الفاظ ہیں کہ "وہ کم ہی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں" لیکن عربی محاورے میں "قلت" عدم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بولتے ہیں "قَلَمَّا سَأَلْتُمْ هَذَا أَقْطُ" (کم ہی کبھی میں نے ایسا دیا ہوگا) یہاں بھی مطلب یہی ہے کہ میں نے بالکل ایسا نہیں دیکھا، اس طرح کے محاورات کلام عرب میں بکثرت ہیں جس میں قلت یا اسے ہم معنی الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لیکن مراد بالکل نفی ہوتی ہے۔

دیدہ دلیری | "وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ" یعنی جب ان یہودیوں کے پاس ایک کتاب الکریمہ

پہنچ گئی اور وہ کتاب ایسی ہے کہ ان کے پاس پہلے سے جو کتاب موجود ہے اس کی تصدیق کرتی ہے۔ "کتاب" سے آیت میں مراد قرآن مجید ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور یہ قرآن مجید تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہما سے یہی روایت ہے کہ آیت میں "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور یہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابوں، توریت و انجیل کی تصدیق کرتی ہے۔

"ذَكَرْنَا مِنْ قَبْلُ لِيَسْتَفْتَحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَقْلَامًا جَاءَهُمْ مَاءٌ عَذْرَ فُؤَا كَفَرُوا وَإِيج" یعنی یہ یہودی جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شان کی کتاب پہنچ چکی ہے، یہ خود بخود اس سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فتح و مدد مانگا کرتے تھے، لیکن جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو یہ لوگ خوب پہنچاتے ہیں تو اس سے کفر کر بیٹھے۔ "اِسْتَفْتَحُوا" (جس سے آیت میں لِيَسْتَفْتَحُونَ کا صیغہ استعمال ہوا ہے) کے معنی مدد چاہنے کے ہیں۔ یعنی یہ یہودی مشرکین عرب کے مقابلہ میں آنحضرت کی بعثت سے پہلے اللہ سے آپ کے ذریعہ مدد چاہا کرتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ انصار کے شیوخ کے حوالہ سے بیان کرتے تھے کہ یہ آیت ہمارے اور مدینہ کے قرب و جوار میں آباد یہودیوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی، وہ بیان کرتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک زمانہ تک (۱۲۰۰ سالوں میں) ان پر غالب رہے، ہم اہل شرک تھے اور وہ اہل کتاب تھے، وہ اس وقت کہتے تھے کہ ایک نبی جلد ہی مبعوث ہونے والے ہیں اور ان کی بعثت کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ تمہیں وہ اس طرح برباد کر دیں گے جیسے پہلی امتوں میں (عاد و ارم کی قومیں برباد کی گئی تھیں) لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو قریش کے قبیلہ میں مبعوث کیا تو انہوں نے آپ کا کفر کیا (کہ آپ بنی اسرائیل ہی میں کیوں نہیں مبعوث ہوئے) اسی واقعہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے کہ "پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو وہ خوب پہنچاتے تھے تو اس کا کفر کر بیٹھے" ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ذریعہ اوس و خزرج کے ساتھ لڑائیوں میں اللہ سے مدد چاہتے تھے، لیکن جب آپ عربوں میں مبعوث ہوئے تو آپ کا انکار کر بیٹھے اور جو باتیں آپ کے متعلق پہلے کہتے تھے اسے خود ہی جھٹلانے لگے۔ ایک مرتبہ ان سے معاذ بن جبل اور بشر بن براء رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہودیوں اللہ سے ڈرو، تم تو خود ہی پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ سے مدد مانگتے تھے، ہم اس وقت اہل شرک میں سے تھے اور تم ہمیں بتاتے تھے کہ آنحضرت مبعوث ہوں گے، تم آنحضرت کے اوصاف بھی بیان کیا کرتے تھے۔ اسپر سلام بن مشکم، جبکہ تعلق یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر سے تھا بولا کہ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں آئی ہے جسے ہم پہنچاتے ہوں، جس کا ہم تم سے ذکر کیا کرتے تھے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم (وہ نہیں ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل کی۔

علی ازدی، قتادہ اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے کہ کفار عرب کے مقابلہ میں یہودی دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ ہمارے پاس اس نبی کو بھیجے جن کا تذکرہ توریت میں موجود ہے تاکہ وہ ان عربوں کو قتل کرے اور انہیں عذاب دے۔ لیکن جب آنحضرت

اس سے بھی یہودیوں کے مزاج کا اندازہ لگا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے یہاں نبی آخر الزماں کے انتظار کی کوئی وجہ تھی تو یہ کہ وہ مبعوث ہونے کے بعد انکو ظالموں کے قتل و غارتگری کا فرض انجام دے گا، کہاں حضور اکرم کی شان رحمت اور کہاں ان کا آپ کے متعلق یہ تخمیں! یہودیوں کے اسی تخریب پسندانہ مزاج اور کفر و عدوان کا نتیجہ ہے کہ انبیاء کی نسل سے ہونے کے باوجود صدیوں سے رسوا اور ذلیل چلی آ رہی ہے۔ تاریخ میں اس قوم کو ایک ہی فتور عون، ایک ہی سخت نکتہ اور ایک ہی میدان تیبہ سے سابقہ نہیں پڑا ہے۔ سرکشی، فساد، کفر اور ناشکری نے ان کے لئے سیکڑوں فرعون پیدا کئے ہیں۔ قدرت نے کتنے ہی بڑے بڑے انبیاء عذاب اور ان کی نسلوں کو تباہ و برباد کر دینے کے لئے ان پر مسلط کئے ہیں اور کتنے ہی میدان تیبہ کی کھنائیوں سے انہیں گزرنا پڑا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے بڑھ کر سخت جان قوم شاید ہی دنیا میں کبھی پیدا ہوئی ہو۔ غالباً اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں عذاب میں مبتلا کرتے رہنے کیلئے ہی انہیں اتنا سخت جان بنایا ہے کہ لوگ دنیا میں ان کو نکال دینے میں جیسا کہ انہیں عذاب دینا چاہتا ہے اور ان کو کبھی فنا نہیں ہونگی۔

کی لعنت عربوں میں ہوئی تو محض حسد کی وجہ سے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل میں کیوں نہ پیدا ہوا، انہوں نے کفر و انکار شروع کر دیا۔ سدی عطا، مجاہد، سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح کی روایتیں ہیں کہ مراد مدینہ کے یہودی ہیں۔

آیت زیر تفسیر میں ذکر ہوا ہے کہ ”جب ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے“ لیکن اس کے بعد یہودیوں کا اسپر رد عمل کیا ہوا؟ اس کے بیان میں آیت بالکل خاموش ہے اور آگے اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ادب عربی کے علماء کہتے ہیں کہ اس کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ جو واقعات بیان ہو رہے ہیں ان سے مخاطب خود سمجھ لیا کہ جب وہ کتاب الہی ان کے پاس پہنچی تو ان کا رد عمل کیا ہوا۔ کوئی کلام جب طویل ہو جاتا تو عربوں کی یہ عادت تھی کہ اکثر جواب کو اور ان چیزوں کو حذف کر دیتے تھے جن کے متعلق اعتماد ہوتا تھا کہ مخاطب یعنی سننے والا خود سمجھ جائے گا۔ اس طرز کلام کی مثالیں خود قرآن مجید میں بھی بکثرت ہیں۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کے آخر کا یہ جملہ کہ ”پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو وہ خوب پہنچانتے تھے تو اس سے کفر کر بیٹھے“ مذکورہ بالا آیت کا جواب ہے یعنی ان یہودیوں کا رد عمل یہ ہوا کہ جب نبی آگئے اور اللہ کی کتاب ان کے پاس پہنچ گئی تو انہوں نے اس سے کفر کر دیا۔ ”فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ“ (سورۃ اللہ کی لعنت ہو کافروں پر) ”لعنت“ اور ”کفر“ کے مفہوم پر اس سے پہلے کی آیتوں میں ہم پوری بحث کر چکے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اللہ نے رسوا کیا اور اپنی رحمت سے دور کیا جو حق کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔

يَسْمَا اَشْتَرُوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

وہ حالت رہت ہی ابری ہے جس کو اختیار کر کے وہ اپنی جانوں کو چھڑا چاہتے ہیں اور وہ حالت یہ ہے کہ کفر کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تواری نے نازل فرمائی محض (اسی) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنی

عَلٰی مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبِئْسَ مَا يَغْضِبُ عَلٰی غَضَبٍ وَّلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِينٌ

فضل جو جس بندہ پر اس کو منظور ہونا نازل فرمائیے یہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہوگی جس میں مدعا وہ تکلیف کے اذیت بھی ہے۔

انکار کی وجہ صرف حسد ہے

”يَسْمَا اَشْتَرُوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا“ ربری ہے وہ چیز جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے، کہ انکار کرتے ہیں اس کلام کا جو اللہ نے نازل کیا

ہے محض حسد کی وجہ سے) ”اَشْتَرُوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ“ کا معنی ہے ”جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے“ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی معنی منقول ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی فرمایا کہ انہوں نے حق کو باطل کے عوض میں بیچ ڈالا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کو عربوں سے چھپانے کی کوشش کی تھی اور یہ بہت بری تجارت تھی۔ عرب بولتے ہیں ”شَرِيْتٌ“ یعنی میں نے بیچ دیا۔ ”اَشْتَرُوْا“ اسی سے مصدر افتعال کا ایک صیغہ ہے۔ عام طور سے کلام عرب میں ”شَرِيْتٌ“ بچنے کے معنی میں اور ”اَشْتَرُوْا“ خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی استعمال کر لیتے ہیں اور آیت میں بھی ”اَشْتَرُوْا“ بچنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے ”بَغْيًا“ کے معنی ہیں حسد، ضد، فتادہ، سدی، ابوالعالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے یہی معنی مروی ہیں، فرمایا کہ انہوں نے محض اس حسد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر و انکار کیا کہ آپ کا تعلق عربوں سے کیوں ہے، آپ بنی اسرائیل میں کیوں نہیں پیدا ہوئے۔ آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب توریت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے متعلق وحی نازل کی تھی اور اس کی تصدیق کا بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا، لیکن انہوں نے، صرف اس ضد میں کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل نازل کیا، توریت کے اس حکم کا انکار کر کے اپنی جانوں کو بہت بری چیز کے بدلہ میں بیچ ڈالا ہے۔ بیچ و شراہ (خرید و فروخت) کا مطلب عرب یہ لیتے ہیں کہ کسی چیز کا اصل مالک اس سے اپنے حقوق ملکیت کو ختم کر کے اس کے بدلہ میں کوئی دوسری چیز لے لے۔ پھر محاورہ کے طور پر ہر بھلی بری چیز کے لئے اس کا استعمال ہوسکتا ہے، کوئی شخص اگر کوئی اچھا یا برا کام کرتا اور اس کا بدلہ کسی صورت میں اسے ملتا تو اس کے لئے بھی بیع و شراہ (خرید و فروخت) کمانے اور حاصل کرنے

کے معنی میں بولا جانے لگا۔ آیت میں بھی محاورہ ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

بنی اسرائیل اصل میں نبوت و حکمت کو اپنی میراث سمجھتے تھے اور قومی تفوق اور برتری کا یہی غیر فطری تصور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے کفر و انکار کا باعث بنا تھا جسرا و رشد کی وجہ سے ان کے کفر و انکار کی مزید تفصیل سورۃ نسا میں موجود ہے، ارشاد ہے، کیا تو نے ان لوگوں پر نظر نہیں کیا جنہیں کتاب سے بہرہ ور کیا گیا تھا، اسپر بھی یہ بت اور شیطان کو مانے ہوئے ہیں اور کفر کرنے والوں کی بابت کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یاب ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور تمہیں پر اللہ لعنت کرے تو تو اس کا کوئی مددگار ہرگز نہ پائے گا، انہیں بھی کچھ اقتدار نصیب ہو جائے تو یہ تو لوگوں کو تل بھر بھی نہ دیں، کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں، ان چیزوں کے باعث جو انہیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہیں، سو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت دی ہے اور ہم نے انہیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے۔

”أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فُضْلِهِ عَلٰی مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ“ (کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل خاص نازل کیا) کا تعلق زیر تفسیر آیت ہی سے ہے اور اس کی تفسیر ہم بیان کر چکے ہیں۔ قتادہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے قبیلہ کے شیوخ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ”بُعْيَا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فُضْلِهِ عَلٰی مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ“ کا مطلب یہ ہے کہ محض اس حسد میں کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت ان کے سوا دوسروں کو کیوں دی دی انہوں نے کفر و انکار کیا، ابو العالیہ، ربیع، سدیی اور علی ازدی سے بھی اسی طرح تفسیر منقول ہے۔

”فَبَاءُوا بِالْغَضَبِ عَلٰی غَضَبٍ“ (سو وہ مستحق ہو گئے غضب بالائے غضب کے) بنی اسرائیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ میں مدد چاہا کرتے تھے، لیکن جب آنحضرت مبعوث ہو گئے تو محض نسلی اور قومی خصمیت، احساس تفوق اور آنحضرت اور عربوں سے حسد کی وجہ سے انہوں نے آپ کا انکار شروع کر دیا پہلے سے انہیں غضب تو تھا ہی، کیونکہ اس سے پہلے وہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کفر کر چکے تھے، گو سالہ کو پوج چکے تھے یا اس کے علاوہ اور بہت سے گناہ جو انہوں نے کئے تھے اور انکی وجہ سے اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے تھے، لیکن اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر و انکار کی وجہ سے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک غضب تو انہیں

اس وجہ سے ہوا تھا کہ انہوں نے تورات کو ضائع کر دیا تھا، پھر دوسرا غضب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر و انکار کی وجہ سے ہوا، قتادہ، ابو العالیہ اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ اللہ کا پہلا غضب انہیں علیہ السلام سے کفر کی وجہ سے ہوا تھا اور دوسرے غضب کے مستحق وہ حضور اکرم کی نبوت سے انکار کی وجہ سے ہوئے، شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے چار مرتبے ہوں گے، ایک تو وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ پر بھی ایمان لایا، اس شخص کو (اس کے ایمان پر) دہرا اجر ملے گا۔ دوسرا وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ السلام کا پہلے سے کافر تھا، لیکن حضور اکرم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لایا تو اسے (اس کے ایمان پر) ایک اجر ملے گا، تیسرا شخص وہ ہو گا جو پہلے سے عیسیٰ علیہ السلام کا بھی کافر تھا، اور جب آنحضرت مبعوث ہوئے تو آپ کا بھی کفر کیا، وہ غضب بالائے غضب کا مستحق ہو گا۔ چوتھا وہ شخص ہو گا جو عیسیٰ علیہ السلام کا کافر تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مر گیا تو وہ ایک غضب کا مستحق ہو گا، مجاہد اور عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہما سے روایت ہے کہ ان پر اللہ کا پہلا غضب اس لئے ہوا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تورات میں تحریف اور تبدیلی کیا کرتے تھے اور دوسرے غضب کے مستحق وہ آنحضرت کی نبوت کے انکار کی وجہ سے ہوئے، سدیی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان پر پہلا غضب گو سالہ پرستی کی وجہ سے ہوا تھا اور دوسرا غضب آنحضرت کے انکار کی وجہ سے۔

”وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ“ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کرنے والے تمام انسانوں پر ذلت کا عذاب ہو گا، یہ عذاب یا صرف آخرت میں ہو گا یا آخرت اور دنیا دونوں میں ہو گا، ”مُّهِينٌ“ ایسے عذاب کو کہتے ہیں کہ جس پر یہ عذاب ہو اسے انتہائی ذلیل و رسوا کر کے رکھ دے، ایک ایسا عذاب جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوا اور جس ذلت میں اسے ڈال دیا گیا ہے اس سے نکلی کر عزت پانے کی کوئی صورت

صفت "مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ" (اس کی بھی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے) اس لئے لائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی تمام کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔ قرآن مجید کی طرح انجیل میں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم ہے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات میں بھی قرآن مجید کی تصدیق اور آنحضرت پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کرنے کی تاکید ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تورات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی دوسری کتابیں جو اس نے اپنے انبیاء پر نازل کی ہیں وہ بھی حق ہیں اور اس کتاب (توریت) کی تصدیق کرتی ہیں جو ان کے پاس موجود ہے۔ "قُلْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُنَّ إِن كُنْتُمْ مَوَدِّعِينَ" یعنی اسے محمد! ان یہودیوں سے جسے آپ جب یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام پر ایمان لاؤ تو یہ آپ کو جواب دیتے ہیں کہ جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، آپ نے کہنے کی اگر یہی بات ہے تو پھر تم اس سے پہلے انبیاء کو قتل کیوں کرتے رہے ہو۔ اللہ نے جو کتاب تم پر نازل کی تھی (یعنی تورات) اس میں تو ان کا قتل تم پر حرام کیا گیا تھا۔ بلکہ تمہیں ان کی اتباع اور پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کو جھٹلایا ہے کہ "ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے" آیت میں انھیں اسپر شرم دلائی گئی ہے۔ سدی رحمتہ اللہ علیہ سے یہی روایت ہے۔ "لَقَاتِلُوا" اگرچہ مفسرین نے اس آیت پر دلالت کرنے والا (والا) کا حینہ ہے لیکن معنی میں ماضی (گذرے ہوئے زمانہ کی خبر دینے کے لئے) ہے۔ کلام عرب میں اس طرح عام استعمال ہے۔

آیت میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں سے ہے، اگرچہ اعمال ان کے "بزرگوں" کے ذکر ہو رہے ہیں یہودیوں کے اسی عام دستور کے مطابق ہے جس کا ذکر کئی مرتبہ ہو چکا ہے۔ "إِن كُنْتُمْ مَوَدِّعِينَ" یعنی جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، اگر واقعی تم اللہ کی اس کتاب پر ایمان والے تھے جو تم پر نازل ہوئی تھی تو پھر تمہارے اسلاف نے انبیاء کو قتل کیسے کیا؟ اور تم ان کے ان افعال سے راضی اور خوش کیوں ہو؟

کھلے ہوئے معجزات کا انکار

"وَلَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ يَتْلُو آيَاتٍ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيكُمْ وَأُخْرَىٰ وَإِن كُنْتُمْ لَكَاذِبِينَ" اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لیکر آئے اسپر بھی تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا اور تم تو یہی ظالم (یعنی تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام ایسے کھلے ہوئے معجزات و نشانات لیکر آئے جو ان کی نبوت کے من جانب اللہ ہونے اور ان کی سچائی پر دلالت کرتے تھے۔ آپ کے معجزات میں ایک عصا کا معجزہ تھا جو صاف اثر دھا بن گیا۔ آپ کا ہاتھ تھا کہ جب آپ نے اسے لکالا تو دیکھنے والوں کے رویے بیک خوب روشن تھا۔ آپ کے عصا مارنے سے سمندر میں راستہ بن گیا اور تمام بنی اسرائیل اس راستے سے سمندر پار کر گئے، ان کی نافرمانی پر جزاؤ (مذہبی دل) ضفادع (مینڈک) اور قمل (جوں) کا ان پر عذاب بھی آپ کے معجزات تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو "بیتات" کہا گیا، کیونکہ دیکھنے والوں کے سامنے ان کا معجزہ ہونا بالکل صاف اور واضح بات تھی اور ان سے ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ کوئی انسان اللہ کی تائید و مدد کے بغیر ایسی چیزیں نہیں دکھا سکتا۔ یہ "بیتات" کھلے ہوئے واضح) کی جمع ہے۔ "ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا آلِهَتَهُمْ آلِهَةً مِّن دُونِ اللَّهِ كَمَا اتَّخَذَ آبَاءُهُمْ آلِهَةً مِّن دُونِ اللَّهِ" یعنی پھر جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے وعدہ کے مطابق طور پر گئے تو تم نے گوسالہ کو اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اگر "بعدہ" میں ہا کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف نہ لوٹائی جائے، بلکہ اس سے "بیتات" مراد لیا جائے اور "ذکر بھی" جو جاء کم میں ہے اس کی طرف ضمیر لوٹائی جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ بیتات اور کھلی ہوئی نشانیوں کے بعد پھر تم نے گوسالہ کو (معبود کی حیثیت سے) اختیار کر لیا۔ بولتے ہیں "بیتات" یعنی تم میرے پاس آئے تو تمہارا آنا مجھے ہر معلوم ہوا۔ یہاں بھی "ہا" کی ضمیر "موسیٰ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "وَأَن تَقُولُوا نَحْنُ نَحْمِلُ صَدَقَاتِهِمْ حَتَّىٰ نَصِلَ آلَ آلِهِمْ" یعنی تمہیں یہ گوسالہ پستی اور غیر اللہ کی عبادت کرنی نہ چاہئے تھی، تم نے اس طرح وہ عمل کیا جسکا تمہیں حق نہیں تھا، کیونکہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو تنبیہ کی ہے اور انہیں شرم دلائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے کھلے ہوئے اور واضح معجزات دیکھنے کے باوجود جب تم ان کی نافرمانی سے باز نہ آئے تو پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے اور اپنی کتاب پر ایمان کے دعوے کے باوجود اس میں حضور اکرم کے

اوصاف سے انکار تمہارے لئے زیادہ آسان ہے۔

« وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا قَوْلَكُمْ الطُّورَ مَخْذُورًا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا » یعنی اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا کہ تورات جو ہم نے تم پر نازل کی ہے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، اس میں مذکور ہمارے احکام پر عمل کرو اور جن چیزوں سے ہم نے تمہیں روکا ہے ان سے بچو اور احکام و نواہی پر عمل طبیعت کے نشاط اور لگن کے ساتھ کرو، تو تم نے اس کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ اس وقت کیا جب ہم نے تمہارے اوپر طور پہاڑ کو بلند کیا۔ « وَاسْمَعُوا » یعنی میرے حکم کو توجہ کے ساتھ سنو، اور طاعت کے ساتھ اسے قبول کرو۔ بولتے ہیں « سَمِعْتُ وَأَطَعْتُ » یعنی میں نے سنا اور تمہارے حکم کی اطاعت کی، اسی طرح آیت میں بھی « وَاسْمَعُوا » کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ تم نے سنا ہے اسے قبول کرو اور اس پر عمل کرو، اس کے بعد ارشاد ہے: « قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا » یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان سے قول و قرار لیا کہ تورات پر عمل کریں اور جو کچھ انہوں نے سنا ہے، اسے اطاعت کے ساتھ قبول کریں تو وہ بولے کہ ہم نے سن تو لیا، لیکن ہم نے مانا نہیں۔ « وَاسْمَعُوا قَوْلَهُمْ انْجَلُ بِكُفْرِهِمْ » (اور ان کے دلوں میں گو سالہ ان کے کفر سابق کے سبب سے پیوست ہو گیا تھا) مفسرین کے اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں کئی اقوال ہیں، قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہم اللہ سے روایت ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے کفر کے سبب سے گو سالہ کی محبت ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھی، دوسرا قول یہ ہے کہ انہوں نے اس دریا کا پانی پیا جس پر گو سالہ (جو مختلف دھاتوں سے تیار کیا گیا تھا) کا برادہ چھڑک دیا گیا تھا اور اسی کے متعلق آیت میں ذکر ہوا ہے، لیکن مناسب تفسیر پہلی ہی ہے، کیونکہ پانی کے متعلق یوں کہی نہیں جاتی کہ « اسْمَعُوا قَوْلَهُمْ » (ظلال نے اپنے دل میں پانی پیا) البتہ کسی چیز کی محبت کیلئے یہ ضرور استعمال ہوتا ہے « اسْمَعُوا قَوْلَهُمْ كَذَا » (ظلال چیز کی محبت ظلال شخص کے دل میں گھر کر گئی ہے) لفظ « سَمِعْتُ » (محبت) کا ذکر آیت میں اس لئے نہیں کیا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ خود گو سالہ کسی کے دل میں پیوست نہیں ہو سکتا، اس کی محبت ہی پیوست ہو سکتی ہے، محاورات زبان میں یہ ایک عام چیز ہے۔

« قُلْ بَشِّرْنَا يَا مَعْرُوفُ بِمَا آتَيْنَاكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ » یعنی اے محمد! ان یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہارا ایمان تمہیں اللہ کے نبیوں اور اس کے رسول کے قتل، اللہ کی کتابوں کو جھٹلانے اور اس کی شریعت کے انکار کرنے کا حکم دیتا ہے تو پھر تمہارا ایمان تمہیں بہت ہی بُری چیز کا حکم دیتا ہے۔ « إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ » یعنی اگر تم واقعی اس کی تصدیق کرنے والے ہو اور اس پر ایمان لانے والے ہو جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو جھٹلایا ہے، کیونکہ تورات تو ان تمام چیزوں سے انہیں روکتی ہے اور اس کے برعکس عمل کا حکم دیتی ہے، ارشاد ہے کہ اگر تورات پر تمہارا ایمان تمہیں یہی حکم دیتا ہے پھر تو یہ حکم بہت ہی برا ہے، اللہ تعالیٰ نے آیت میں بتایا ہے کہ تورات میں اس طرح کا کوئی حکم نہیں، یہ تو تورات اور اللہ کے حکم کی سرسرخ مخالفت ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوْا

آپ کہہ دیجئے کہ اگر (تو) تمہارے عالم آخرت محض تمہارا ہی ہو، نافع ہے بلا شریک غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھلا دو

المُوتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَنْ يَتَمَنَّوْا أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَاللَّهُ

اگر تم (اس دعویٰ میں) سچ ہو، اور وہ (پہرے) کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کرے گا، جو بوجہ خوف نینا، ان اعمال (کہ) یہ اگر جو اپنی اچھی سمیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوب

عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا

اطلاع ہے ان ظالموں کو حال (کی) اور آپ (تو) ان کو حیات (دنیویہ) کا حریص اور (عام) آدمیوں کو (بھی) بڑھکر پادیں گے، اور مشرکین سے بھی ان میں کا

يَوْمًا أَحَدُهُمْ كَوْيَعْمَرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُرَّخِحِجِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَلَّا

ایک ایک شخص اس ہوس میں ہو کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہو جائیگی اور یہ عذاب سے تو نہیں بچا سکتا کہ کسی کی بڑی عمر ہو جائے

يَعْمَرُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٤٠﴾

اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بد)

موت کی آرزو کر کے دیکھو

”قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ الدُّنْيَا لَأَلْمَسْنَاكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ“ (آپ کہہ دیجئے کہ اگر عالم آخرت خاص تمہارے

ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر، تو موت کی آرزو کر دیکھو، اگر تم سچے ہو)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود یہودیوں پر اپنی جت تمام کر دی ہے۔ ایک مرتبہ مدینہ میں نصاریٰ کی ایک جماعت نے آکر عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں حضور اکرم سے بحث اور کٹھ جتنی کی تھی تو اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ نصرا نیوں کی اس جماعت کو مباہلہ کی دعوت دیں، اس آیت میں یہودیوں کے سلسلے میں آنحضرت کو اسی طرح کا حکم ہوا ہے کہ انھیں آپ سے جو اختلاف ہے اس کا فیصلہ کرنے کیلئے آپ کی وہ ایک ایسی بات مان لیں جس سے انھیں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے اور پھر سارے اختلافات کا خود ہی اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ثانی یعنی یہودیوں سے فرماتا ہے کہ اگر تم حق پر ہو (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے) تو پھر موت کی آرزو کر کے دیکھو، اگر تم واقعی حق پر ہوئے تو موت کی آرزو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، کیونکہ تمہیں اللہ سے قرب اور ایمان حقیقی کا دعویٰ ہے، بلکہ موت تو تمہارے لئے اور اس دنیا کی پریشانیوں اور تفکرات سے نجات کا باعث بن جائے گی تمہیں اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا جوار، اس کی خوشنودی اور آخرت کی نعمتیں ملیں گی، کیونکہ تمہارا تو بہر حال یہ عقیدہ ہے ہی کہ آخرت کی تمام نعمتوں کے تہا صرف تمہیں مستحق ہو، ہم مسلمانوں کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے تو پھر تمہیں سب سے پہلے اس کی تمنا کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تم موت کی آرزو نہیں کرتے تو سب پر یہ بات کھل جائے گی کہ تم حق پر نہیں ہو، بلکہ حق پر ہم ہیں۔ اسی پر ہمارے اور تمہارے فیصلہ کا دار و مدار ہے کہ تم موت کی آرزو کرتے ہو یا نہیں، لیکن یہودیوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا اور موت کی آرزو کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو وہ ہلاک و تباہ ہو جائیں گے اور دنیا کے ساتھ آخرت میں بھی ان کے لئے نامرادی اور ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ نصاریٰ نے بھی جب مدینہ آکر عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں کٹھ جتنی کی تھی اور آنحضرت نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی تھی تو انہوں نے بھی اس چیلنج کو قبول نہیں کیا تھا اور اس چلے گئے تھے۔ یہ حدیث ہمیں معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہودیوں نے اس آیت کے چیلنج کو قبول کر لیا ہوتا اور موت کی آرزو کر لی ہوتی تو سب مرجاتے اور جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا لیتے۔ اسی طرح جن عیسائیوں کو آپ نے دعوت مباہلہ دی تھی اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو یقیناً جب وہ گھر واپس ہوتے تو نہ انھیں ان کے اہل و عیال ملتے اور نہ ان کے مال و اسباب کا کہیں پتہ چلتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر اس آیت کے جواب میں یہودیوں نے موت کی آرزو کا اظہار کر دیا ہوتا تو سب مرجاتے۔ آپ ہی سے ایک روایت میں ہے کہ روم پر کوئی یہودی زندہ باقی نہ بچتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو ایک دعوت دی تھی اور انہوں نے اس سے پھر کر ساری دنیا پر ثابت کر دیا کہ وہ حق پر نہیں تھے، نصرا نیوں کو بھی اسی طرح کی ایک دعوت دی تھی اور انہوں نے بھی فرار اختیار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنے دین حق کو سب کے سامنے واضح کر دیا اور کسی کیلئے اس سے انکار و اعراض کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہودی کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے عزیز و محبوب ہیں، جنت میں یہودیوں کے سوا اور

کوئی نہیں جائے گا۔ یہی دعویٰ عیسا یوں کا بھی تھا کہ نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو موت کی آرزو کرنے کی دعوت دے کر ان کے جھوٹ اور بے سرو پا دعویٰ کا بھرم کھول دیا۔

مفسرین کے اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں کہ یہودیوں سے اللہ تعالیٰ نے موت کی آرزو کرنے کے لئے کیوں کہا تھا؟ اور اسکی صورت کیا تھی؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس کی صورت یہ تھی کہ دونوں فریقوں (مسلمانوں اور نبی اسرائیل) میں سے جو جھوٹا ہوتا اسی کے لئے بد دعا کا انہیں حکم ہوا تھا کہ ان میں سے جو بھی جھوٹا ہو اس کے لئے تم موت کی آرزو کرو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ نبی اسرائیل کہا کرتے تھے کہ جنت میں تو صرف یہودی داخل ہوں گے، کہتے کہ ہم اللہ کے اولاد اور اس کے عزیز و محبوب ہیں۔ اس لئے ان سے کہا گیا کہ تم سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کر کے دیکھو۔ لیکن انہوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ یہ روایت ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی منقول ہے۔ **قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً** "کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! یہودیوں سے کہئے کہ آخرت کی نعمتیں اور وہاں کی لذتیں گھر تمہارے ہی لئے ہیں۔ آیت میں صرف "الدَّارُ الْآخِرَةُ" (عالم آخرت) کہا، کیونکہ اس سے اس کی نعمتوں اور جنتوں کا مفہوم خود سمجھ میں آجاتا ہے۔ "خَالِصَةً" یعنی بے غبار، تنہا۔ بولنے میں "خَلَصَ لِيْ فُلَانٌ" یعنی فلاں چیز تمہارا میرے لئے ہو گئی۔ "خَالِصَةً" غائبیہ کی طرح مصدر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ "خَالِصَةً" کی تفسیر خاص سے کیا کرتے تھے لیکن یہ غریب ہے۔ "مِنْ دُوْنِ النَّاسِ" یعنی یہودی کہا کرتے تھے کہ عالم آخرت کی نعمتیں ہمارے ہی لئے ہیں۔ دو سکر تمام انسانوں کو چھوڑ کر "آیت کی ظاہری ترتیب سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس سلسلے میں نبی اسرائیل تمام نبی آدم کا استثنا کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے متعلق ایک موقع پر فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہودیوں کے سوا اور کوئی نہیں داخل ہو گا۔ لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ آپ "مِنْ دُوْنِ النَّاسِ" کا مفہوم یہ بیان کرتے تھے کہ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو چھوڑ کر" یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ عالم آخرت کی نعمتیں انہیں کو ملیں گی۔ حضور اکرم اور آپ کے صحابہ کو نہیں ملیں گی۔ "وَقَتْمَنُوْا الْمَوْتِ" یعنی موت کی آرزو کر کے دیکھو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "موت مانگ کے دیکھو" لیکن کلام عسیر میں "تمنی" مانگنے اور سوال کرنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہ تھا کہ "تمنی" میں بھی آرزو اور غنبت ہوتی ہے اور "سوال" میں بھی سائل کو رغبت ہوتی۔ اس اشتراک کی وجہ سے آپ نے "تمنی" کا ترجمہ بھی سوال کیا۔

وَلَنْ يَتَمَنَّوْا۟ اَبَدًاۙ اَبَدًاۙ قَدًاۙ مَّتَّ اٰیٰتِیْمٌ وَّاللّٰهُ عَلِیْمٌۙ بِالظَّٰلِمِیْنَ "لیکن وہ اس کی آرزو نہ کرے گی نہ کریں گے، بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں، اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ موت سے یہودی کانپتے ہیں، اس لئے حضور اکرم کے اس چیلنج کو بھی قبول نہیں کریں گے اور موت کی آرزو نہ کریں گے۔ کیونکہ یہودی اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو اس سے بچ نہیں سکیں گے، وہ اس سے بھی لاعلم نہیں تھے کہ آنحضرت واقعی اللہ کے نبی ہیں اور جتنی خبریں آپ نے دی ہیں وہ سب سچ ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لئے اس کا بھی خوف تھا کہ اگر انہوں نے موت کی آرزو کی تو موت کی صورت میں اللہ کا عذاب ان کے اعمال بد کے بدلہ میں ان پر نازل ہو کے رہے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ موت کی آرزو کو بھی نہیں کریں گے بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں، یعنی بسبب اس کے کہ آپ کی نبوت کے متعلق یقینی علم کے باوجود وہ آپ سے کفر کرتے ہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہودی موت سے سب سے زیادہ بھاگتے تھے، اور کبھی موت کی آرزو کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

"بِمَا قَدَّ مَّتَّ اٰیٰتِیْمٌ" یعنی بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں۔ یہ عربی کا ایک مشہور و معروف محاورہ ہے کوئی شے اگر کوئی حرم کرے اور اس سے زیادہ بھاگتے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ "نَا لَکَ هٰذَا بِمَا جَنَّتَ یَدَاکَ" (یعنی یہ تمہارے ہاتھوں

کی کرنی ہے) اس مفہوم کے لئے (بِجَانْتِ يَدَاكَ بِجَانْتِ يَدَاكَ) ”بِجَانْتِ يَدَاكَ“ ”یا“ بِمَا قَدَّ سَتَّ يَدَاكَ“ بھی بولتے تھے۔ ضروری نہیں تھا کہ جرم کا ارتکاب مجرم نے ہاتھ (یَدَا) ہی سے کیا ہو، دو کے اعضا مثلاً زبان وغیرہ کے جرم پر بھی جو سزا سے ملتی اس کے لئے بھی یہی محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہاتھ ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام انجام پاتے ہیں، اس لئے کاموں کی نسبت کے لئے اسے ہی محاورہ میں استعمال کرنے لگے۔ آیت میں بھی یہی صورت ہے، ارشاد ہے کہ ”لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كُفْرًا كَمَا جَعَلَ لِلْيَهُودِ عَلَى النَّاصِرِينَ كُفْرًا كَمَا جَعَلَ لِلْيَهُودِ عَلَى النَّاصِرِينَ كُفْرًا كَمَا جَعَلَ لِلْيَهُودِ عَلَى النَّاصِرِينَ كُفْرًا“ (یعنی وہ موت کی آرزو ہرگز کبھی نہیں کریں گے، بسبب اس کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں) آیت میں ان کے جن اعمال کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق ان کے دل سے تھا، کہ آنحضرت کے حق ہونے اور آپ کے نبی مبعوث ہونے کے متعلق وہ دل سے یقین رکھتے تھے، خوب سمجھتے تھے، لیکن اسے انہوں نے چھپا رکھا تھا، اسی طرح اس کا تعلق ان کی زبان سے تھا کہ حضور اکرم کے خلاف حسد و دشمنی کی وجہ سے، بولتے رہتے تھے اور آپ کی رسالت کا انکار کرتے رہتے تھے اور ان کے انھیں اعمال کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ ان الفاظ سے کیا ہے کہ ”جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں“ عرب زبان کے عادات سے بخوبی واقف تھے اس لئے انھیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کے سلسلے میں روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت کی رسالت کو پہچانا اور اس کے باوجود کفر کیا، یہی ان کے اعمال تھے جنہیں ان کے ہاتھ سمیٹ چکے تھے۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ“ یعنی اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے، خواہ وہ یہودی ہوں، نصرانی ہوں یا کسی دوسرے مذہب والے ہوں ان کا کوئی عمل اور ان کا حسد سے تجاوز کرنا اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے، یہودیوں کا ظلم یہ تھا کہ اللہ کے حکم کے خلاف عمل کر کے اس سے کفر کرتے تھے اور اس کے باوجود کہ پہلے سے آنحضرت کے ذریعہ فتح کی دعائیں لگاتے تھے، جب آپ کی بعثت ہوئی تو انکار کر بیٹھے۔

دل کا چور

”وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْيَهُودِ عَلَى النَّاصِرِينَ كُفْرًا كَمَا جَعَلَ لِلْيَهُودِ عَلَى النَّاصِرِينَ كُفْرًا“ یعنی اے محمد! آپ دنیا کی زندگی پر حرصیں اور موت سے دور بھاگنے والا سب سے زیادہ ان یہودیوں کو پائیں گے ابو العالیہ، ریح اور مجاہد رحمہم اللہ سے یہی روایت ہے۔ وہ موت سے سب سے زیادہ اس لئے گھبراتے تھے کہ اپنے اعمال کے بدلہ میں انھیں یقین تھا کہ آخرت میں ذلت و رسوائی اور عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ”وَمِنَ الَّذِينَ آمَنُوا كُفْرًا“ یعنی یہودی مشرکوں سے بھی بڑھ کر زندگی پر حرصیں ہیں، کیونکہ مشرکین آخرت کی زندگی اور حشر و نشر پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس کے مقابلہ میں یہودی ان چیزوں پر ایمان رکھتے تھے، اس لئے دنیاوی زندگی کی محبت اور موت سے فرار ان میں مشرکین سے بھی زیادہ موجود تھا، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد مجوسی ہیں، کہ آپ یہودیوں کو ان سے بھی زیادہ زندگی پر حرصیں پائیں گے۔

ابو العالیہ اور ریح رحمہما اللہ سے یہی روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مشرکین مراد لئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وجہ یہ تھی کہ مشرک موت کے بعد حشر و نشر میں یقین نہیں رکھتا، اس لئے وہ صرف اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ طویل زندگی دنیا میں مل جائے، لیکن یہودی آخرت میں اپنی اس رسوائی اور ذلت سے خوب واقف تھے اور خوب سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال کا کیا بدلہ وہاں ملے گا۔ ”يَوْمَ لَا يَنْفَعُ كُفْرًا كُفْرًا“ سے مراد مشرکین ہیں جن کے مقابلہ میں یہودی زندگی پر زیادہ حرصیں ہیں۔ ان مشرکین کے متعلق ارشاد ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ کاش! ہزار برس کی عمر مل جائے، کبھی زندگی ختم ہی نہ ہو، دنیا میں جیسی کیسی بھی خوشی و مسرت انھیں حاصل ہے وہ کبھی ختم نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مراد ہم کے مشرکین ہیں جو ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے وقت کہتے تھے کہ ہزار سال زندہ رہو، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے ایک روایت میں ہے کہ اہل شرک کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی چھینکتا تو کہتے کہ ”ہزار سال زندہ رہو“ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”گناہوں اور غلط کاریوں نے ان کے دل میں زندگی سے محبت پیدا کر دی تھی“ اسی طرح کی روایات ابن ابی نجیم اور ابن زبیر رحمہما اللہ سے بھی ہیں۔ وَمَا هُوَ بِمَنْزِلَةِ حَبِثٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ لَيْسَ بِمَنْزِلَةِ حَبِثٍ“ (حالانکہ اتنی عمارتوں کا بھی جائزے تو یہ امر اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا) یعنی دراندازی عمر کسی انسان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ ”بِمَنْزِلَةِ حَبِثٍ“ یعنی نکالنے والا، نجات دینے والا۔ ”مَنْ حَوَّجَ“ سے نکلا ہے، یعنی دور کرنا، نکالنا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آیت کا

مطلب یہ ہے کہ ”در ازی عمر بہت دنوں تک زندہ رہا جانا کسی کو اللہ کے عذاب سے نجات نہیں دلا دے گا“ ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ لوگ مراد ہیں جو جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے (یعنی یہودی) ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آیت کی یہی تفسیر منقول ہے ”وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ“ یعنی جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے، اس سے ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ ضرور دے گا۔ ”بَصِيْرٌ“ یعنی دیکھنے والا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا

راپ ان سے یہ کہہ کر جو شخص جبریل سے عداوت رکھے۔ سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے۔ خداوندی حکم سے اُسکی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے

بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبَشْرًا لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ

ان سے قبل الی (سادہ) کتابوں کی درہنمائی کر رہا، اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو جو کوئی شخص خدا کا دشمن ہو اور فرشتوں کا (ہو) اور پیغمبروں کا (ہو)

وَمِنْ سُلَيْمٍ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَائيلَ ۝ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ ۝

اور جبریل کا (ہو) اور میکائیل کا (ہو) اور ایسا (تو) ان سب کا وبال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

جبریل علیہ السلام سے دشمنی

نازل کیا ہے (مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے یہودیوں کے جواب میں نازل ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ جبریل (علیہ السلام) ہمارے

دشمن ہیں، اور میکائیل علیہ السلام ہمارے ہمدرد اور ہمی خواہ ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں کہ یہودی جبریل

علیہ السلام کو اپنا دشمن کیوں سمجھتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں آئی اور کہا کہ اے ابو القاسم! ہم آپ سے چند ایسی باتیں پوچھنا چاہتے ہیں جنہیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آنحضرت نے فرمایا

کہ جو تمہارا جی چاہے پوچھو، لیکن پہلے مجھ سے عہد کر لو کہ اگر میں نے تمہارے تمام سوالات کے جوابات صحیح و درست دینے اور تمہارے

خیال کے مطابق بھی وہ صحیح ہوئے تو تم اسلام قبول کر لو گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا ہماری طرف سے وعدہ ہے۔ اس پر آنحضرت نے

فرمایا کہ پھر تمہارا جو جی چاہے پوچھو۔ انہوں نے پوچھا کہ چار چیزوں کے متعلق ہم آپ سے سوال کرنا چاہتے ہیں آپ ہمیں بتائیے کہ اسرائیل

(یعقوب علیہ السلام) نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر کون سا کھانا حرام کیا تھا؟ مرد اور عورت کے پانی کی کیا کیفیت ہوتی

ہے؟ اولاد کبھی مذکورہ اور کبھی مؤنث کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اور اس ”نبی امی“ کے متعلق ہمیں بتائیے جنکا ذکر تورات میں ہے اور یہ کہ ملائکہ

میں سے ان کا دوست کون ہوگا؟ آنحضرت نے پھر فرمایا کہ جو تم نے مجھ سے عہد کیا، وہ یاد رکھنا کہ اگر میں نے جوابات تمہیں ٹھیک ٹھیک

دیدئے تو تم ایمان لاؤ گے۔ انہوں نے بھی اپنے وعدہ پر قائم رہنے کا خوب یقین دلایا۔ پھر آنحضرت نے فرمایا تمہیں میں اس ذات کی

قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورت نازل کی، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ایک مرتبہ شدید

بیمار پڑے، جب بیماری نے طول کھینچا تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے انہیں شفا دے دی تو سب سے زیادہ مرغوب اور پسندیدہ کھانا

اور مشروب اپنے اوپر حرام کر لیں گے۔ اور سب سے زیادہ انہیں اونٹ کا گوشت پسند تھا۔ مصنف کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے اللہ

سب سے زیادہ مرغوب مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ اس پر وہ تمام یہودی بول پڑے، اللہ گواہ ہے، آپ نے بالکل ٹھیک بات بتائی

پھر حضور اکرم نے فرمایا، میں تم پر اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور اس ذات کی تمہیں قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل

کیا، کیا تمہیں معلوم ہے کہ مرد کا پانی (مسی) سفید اور گاڑھا ہوتا ہے، اور عورت کا پانی پتلا اور زرد ہوتا ہے اور ان میں سے جو کچھ

غالب رہتا ہے، بچہ اس کے مشابہ پیدا ہوتا ہے، اگرچہ بھی اللہ کے حکم پر منحصر ہے۔ پس اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ گیا تو لڑکی پیدا ہوگی اور اگر مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آ گیا تو لڑکا پیدا ہوگا اللہ کے حکم سے۔ یہ سن کر بھی انہوں نے کہا کہ اللہ گواہ ہے۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ اس کے بعد آنحضرت نے فرمایا کہ میں تم سے اللہ کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس ”نبی اُمی“ کی (جسکا ذکر تورات میں ہے) آنکھیں (نیند میں) سوتی ہیں، لیکن دل ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ اس پر بھی انہوں نے کہا کہ اللہ گواہ ہے، آپ نے سچ کہا۔ آنحضرت نے فرمایا، اے اللہ! گواہ رہنا۔ اب یہودیوں نے کہا کہ ہمارا آخری فیصلہ اس پر موقوف ہے کہ فرشتوں میں آپ کا دوست کون ہے، اس جواب پر یا ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپ سے جدا ہو جائیں گے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ میرے دوست جبریل علیہ السلام ہیں، اور اللہ نے جب کبھی اپنا رسول بھیجا تو انھیں کو ان کا دوست بنایا۔ یہودی اس پر پوچھے کہ پھر تو ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اگر ان کے علاوہ کوئی اور فرشتہ آپ کا دوست ہوتا تو ہم آپ پر ضرور ایمان لاتے۔ آنحضرت نے دریافت فرمایا کہ آخر بات کیا ہے کہ تم ان کی وجہ سے ایمان نہیں لاؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات آخر تک نازل کیں، اسی طرح کی روایتیں شہر بن جو شیب اشعری اور ابن ابی بنزہ سے بھی ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا قول یہ ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور یہودیوں کے درمیان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے سلسلے میں ایک مرتبہ بحث ہوئی تھی۔ اور آیت اسی پر نازل ہوئی ہے چنانچہ شعبی سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ مقام ”ذوحا“ تشریف لے گئے (اپنے زمانہ خلافت میں) وہاں آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک پتھر کے پاس پہنچنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہاں نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کسی نے آپ کو بتایا کہ یہ لوگ ایسا اس لئے کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک موقع پر نماز پڑھی تھی، لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اس طرز عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کسی بھی وادی میں جب نماز کا وقت ہو جاتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہیں نماز پڑھ لیتے تھے، اور پھر وہاں سے کوچ کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ لوگوں سے ایک حدیث بیان کرنے لگے۔ فرمایا کہ یہودیوں کا مذہبی درس جس دن ہوتا تو میں بھی وہاں جایا کرتا تھا اور تورات کے مضامین سن کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح تورت، قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہے اور اسی طرح قرآن مجید، تورت کی تصدیق کرتا ہے۔

ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا، عمر! تمہارے تمام ساتھیوں میں تم سے زیادہ عزیز نہیں کوئی نہیں ہے میں نے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم ہمارے پاس آتے جاتے ہو اور ہم سے تعلق رکھتے ہو۔ میں نے کہا کہ میں تو آتا ہوں اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتا ہوں کہ تورت کس طرح قرآن مجید کی تصدیق کرتی ہے اور اسی طرح قرآن مجید کس طرح تورت کی تصدیق کرتا ہے۔

بیان کیا کہ اتنے میں ادھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گذرے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ابن خطاب! یہ تمہارے ساتھی جا رہے ہیں، انھیں کے ساتھ چلے جاؤ۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم ہے کہ آنحضرت اللہ کے رسول ہیں؟ اس پر وہ سب خاموش ہو گئے۔ ان میں جو سب سے بڑا عالم تھا اس نے کہا کہ عمر کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہم میں سب سے زیادہ علم والے اور ہمارے سردار ہیں، آپ ہی انھیں جواب دیجئے۔ اس عالم نے مجھے یہ جواب دیا کہ جب تم نے اللہ کا واسطہ دیا ہے تو سنو کہ میں معلوم ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر میں نے کہا، افسوس ہے، پھر تو تم ہلاک و برباد ہو گئے۔ آپ کا انکار کر کے، اس عالم نے کہا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہم تباہ و برباد ہو گئے۔ میں نے کہا کہ پھر اور کیا ہوا؟ تم خود کہتے ہو کہ آنحضرت اللہ کے رسول ہیں، اور اس کے باوجود آپ کی تمہاری تصدیق کرتے اور تابتا کرتے۔ انہوں نے کہا کہ اصل میں فرشتوں میں ایک ہمارا دشمن ہے اور ایک فرشتہ ہمارا دوست ہے، جو فرشتہ ہمارا دشمن ہے وہ تمہارے

نبی کے ساتھ متعلق ہے، اس لئے ہم ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ میں نے پوچھا کہ کون تمہارا دشمن ہے اور کون دوست ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارا دشمن جبریل (علیہ السلام) ہے اور ہمارے دوست میکائیل (علیہ السلام) ہیں۔ میں نے پوچھا جبریل علیہ السلام سے کس بات پر تمہاری دشمنی ہو گئی۔ اور میکائیل علیہ السلام کس طرح تمہارے دوست بن گئے؟ وہ کہنے لگے کہ جبریل (علیہ السلام) تنگی، تشدد، سختی اور عذاب کے فرشتہ ہیں۔ اس کے برعکس میکائیل (علیہ السلام) نرمی، رحمت اور تحفیف کے فرشتہ ہیں؛ میں نے پوچھا، اچھا تمہارے نزدیک ان دونوں فرشتوں کا اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کیا مرتبہ ہے؟ کہنے لگے کہ ان میں سے ایک اللہ کے دائیں طرف کھڑا ہوتا ہے اور دوسرا بائیں طرف میں نے اس پر کہا کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، پھر وہ دونوں فرشتے اور وہ ذات جو تمہارے خیال کے مطابق ان کے درمیان میں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) ان کے دشمن ہیں جو ان میں سے کسی سے دشمنی رکھے اور جو ان سب کو مانتے ہیں انہیں، وہ بھی عزیز اور اپنا دوست رکھتے ہیں۔ ممکن نہیں کہ جبریل علیہ السلام کسی ایسے شخص کو اپنا دوست بنا لیں جو میکائیل علیہ السلام سے دشمنی رکھتا ہو اور نہ میکائیل علیہ السلام ایسے شخص کو دوست بنا سکتے ہیں جو جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتا ہو۔ اس کے بعد میں کھڑا ہو گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلے چل کر آپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آنحضرت نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی چند آیتیں مجھ پر نازل ہوئی ہیں اور پھر آپ نے مذکورہ بالا آیتیں "آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے تو انہوں نے تو اس قرآن کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے" آخر آیات تک میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں تو اس غرض سے اس وقت حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو ایک واقعہ کی اطلاع دوں گا، لیکن اللہ لطیف و خبیر نے مجھ سے پہلے ہی اس کی اطلاع آپ کو دیدی ہے۔ یہ روایت قتادہ، سعدی، عبدالرحمن بن ابی بلیی اور عطار رحمہم اللہ سے بھی اختصار کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ "مَنْ كَانَ قَدًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ" کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد! نبی اسرائیل کے یہودی جنکا یہ خیال ہے کہ جبریل ان کے دشمن ہیں۔ کیونکہ وہ عذاب، غضب اور سزا کے فرشتہ ہیں۔ وحی و رحمت کے وہ فرشتہ نہیں ہیں اور اس لئے وہ آپ کی اتباع سے گریز کرتے ہیں۔ آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ جبریل آپ کے رفیق اور دوست ہیں اور وہ میری وحی آپ تک پہنچاتے ہیں، ان تمام آیات اور نشانیوں کے منکر ہیں جو میری طرف سے نازل ہوئی ہیں، تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں جبریل کا دوست ہوں اور صرف میری ہی طرف نہیں بلکہ پچھلے تمام انبیاء اور رسولوں کی طرف اللہ کی وحی وہی لیکر آتے رہے ہیں اور وہی میرے قلب پر بھی اللہ کے حکم سے وحی نازل کرتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ سے اسی طرح روایت ہے۔

"نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ" یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر قرآن کو اتارا ہے۔

۱۵ اس سائٹیفک دور میں کون سمجھ سکتا ہے کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے بحث و مباحثہ میں کس طرح کے دلائل سے مخالف فریق کو قائل کیا جاسکتا تھا اور اس دور میں لوگوں کے سوچنے کا انداز کیا تھا۔ بنی اسرائیل میں صدیوں سے نبوت و رسالت چلی آ رہی تھی اور وحی، جنت و دوزخ اور فرشتوں کے متعلق ان کے خاص نظریات تھے اور سینکڑوں قسم کی تحریف و تبدیلی کے بعد ان کے ان معتقدات نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی تھی جو ان کے مزاج اور ان کے ماحول سے بھی پوری طرح مطابقت رکھتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ سے کفر کی وہ مختلف وجوہ بیان کرنے تھے اور ایک میں بھی معقولیت نہیں ہوتی تھی۔ قرآن ان کے ان معتقدات کی تردید کرتے ہوئے ان کی ایسی نامعقول روش کو موثر انداز میں بیان کرتا چلا جاتا ہے نبوت و رسالت اور ایمان سے متعلق جتنے بھی امور میں ان سب کا تعلق غیب سے ہے اور ذہنی طور پر اہل کتاب ان سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی تھے اور واقفیت بھی رکھتے تھے اس کے علاوہ ان چیزوں میں اہل کتاب کے رد عمل کا اثر بھی قبول کیا جاتا تھا۔ اسی لئے قرآن مجید نے جگہ جگہ انہیں مخاطب کیا ہے اور حق اور سچائی کو ان کے سامنے رکھا ہے۔ (مترجم)

”جبریل“ کو عرب کئی طرح سے پڑھتے تھے۔ اہل حجاز ”جبریل“، ”میکائیل“ پڑھتے ہیں، اہل مدینہ اور اہل بصرہ کی بھی عام قرأت یہی ہے۔ قبیلہ تمیم، قیس اور بعض نجد کے قبائل ”جبریل“، ”میکائیل“، ”جیم“ اور راء پر زبر ہمزہ اور اس کے بدیاء کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کوزہ کی عام قرأت یہی ہے۔ ”جبریل“ جس میں جیم پر تیز زبر ہو، لیکن یار سے پہلے ہمزہ نہ ہو۔ یہ قرأت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ کلام عرب میں اس زن کا کوئی لفظ وجود نہیں ہے۔ قبیلہ نیواسد ”جبریل“ نون کے ساتھ پڑھتے تھے۔ بعض اہل عرب سے ”جبریل“، ”میکائیل“ الف کے اضافہ کے ساتھ بھی سنا گیا ہے، یحییٰ بن یحییٰ ”جبریل“ پڑھتے تھے۔ سریانی زبان میں جبر اور میک ”کامعنی“ غلام ہے اور اہل بلعنی اللہ یعنی اللہ کا بندہ (سعید بن جبیر، عکرمہ، علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہم سے یہی روایت ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے، علی بن حسین نے فرمایا کہ جو اسم بھی ”راہیل“ کی طرف منسوب ہو کے ذکر ہوگا اس کا مفہوم یہی ہوگا کہ اللہ کی عبادت و بندگی کرنے والا۔ لیکن جن حضرات نے ”جبریل“ پڑھا ہے ان کے نزدیک ”آلہ“ عربی لفظ ہوگا بمعنی اللہ وہ کہتے ہیں کہ ”لَا يَدْقُبُونَ فِي مَوَدِّ مِّنْ رَّالَا وَلَا دِقْمَةٌ“ کسی مومن کے باب میں یہ لوگ نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول و قرار کا اس میں بھی یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔

”مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ“ یعنی قرآن سے پہلے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانی کتابیں نازل ہو چکی ہیں، قرآن مجید ان سب کی تصدیق کرنے والا ہے۔ تصدیق کا مفہوم یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انبیاء کے حکم سے متعلق اور اس شریعت سے متعلق جسے آپ لیکر مبعوث ہوئے تھے، قرآن مجید کے مضامین پچھلی تمام آسمانی کتابوں کے مضامین کے مطابق ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ کتابیں جو قرآن مجید سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور وہ انبیاء جو آنحضرت سے پہلے تھے، مثلاً موسیٰ، ہود، شعیب، صالح علیہم السلام اور دوسرے انبیاء، قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے۔ قتادہ اور زبیر رحمۃ اللہ علیہما سے بھی روایت ہے کہ قرآن مجید، تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ ”وَصَدِّقًا لِّبَشَرَاتِ الْوَعْدِ“ (اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے) ”صَدِّقًا“ کے معنی ہیں دلیل و برہان۔ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے ”صَدِّقًا“ اس لئے کہا کہ مومنین اس کے ذریعہ ہدایت اور سیدھا راستہ پاتے ہیں، حلال و حرام اور اللہ کا حکم وہی اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ ”صَدِّقًا“ (جو صدق ہے) کا اسم فاعل ہے کسی بھی چیز کا وہ ہوتا ہے جو اس سے آگے ہو اس لئے ان گھوڑوں کو جو دوسرے گھوڑوں سے بڑھ جائیں ”صَدِّقًا“ کہتے ہیں۔ گردن کو بھی ”صَدِّقًا“ اسی مناسبت سے کہتے ہیں کہ وہ تمام جسم سے اوپر ہوتی ہے۔ ”بَشَرَاتِ“ یعنی بشارت و خوشخبری۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے کہتا ہے کہ قرآن مجید اس کی طرف سے ان کے لئے خوشخبری ہے، اس لئے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جنت اور اس کی نعمتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں جو اس نے اپنے مومن بندوں کیلئے آخرت میں تیار کر رکھی ہیں اور جو اس دنیاوی زندگی کے ختم ہونے کے بعد مومنوں کو دی جائیں گی۔ ”بَشَرَاتِ“ کا مفہوم کلام عرب میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی اچھی خبر سنائی جائے جس کا علم اسے پہلے سے نہ ہو اور نہ اس سے پہلے اس نے یہ خبر اس کے علاوہ کسی اور سے سنی ہو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ قرآن مجید ہدایت اور منوں کے لئے خوشخبری اس لئے ہے کہ مومن جب قرآن سنتا ہے تو اسے پوری طرح یاد کر لیتا ہے اور اس کے مضامین سے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اسے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو وعدے اس میں کئے ہیں دل سے ان کی تصدیق کرتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔

”مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ“ (جو کوئی دشمن ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبریل کا یا میکائیل کا تو اللہ بھی بالیقین دشمن ہے کافروں کا) آیت میں لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بھی اس کا دشمن ہے، جبریل علیہ السلام یا کسی فرشتے سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہی کیونکہ فرشتے اور انبیاء اس کے دلی اور اس کے فرمانبردار بندے ہیں، پس جو شخص اللہ کے دلی کا دشمن ہے وہ براہ راست اللہ کا دشمن ہے اور اس قادر و توانا سے ہر پیکار ہو نا چاہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کا دشمن ہے وہ اس کے تمام اولیاء اور فرمانبردار بندوں کا

دشمن ہے۔ آیت میں خطاب خاص یہودیوں سے ہے جو کہتے تھے کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں اور میکائیل ہمارے دوست ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ غلط ہے، جبریل سے دشمنی رکھنے والے کو اللہ اور اس کا کوئی فرشتہ اپنا دوست نہیں رکھ سکتا، جو لوگ جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے ہیں وہ تمام ملائکہ، انبیاء اور اللہ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اللہ کے کسی رسول، فرشتہ یا ولی کا دشمن اللہ اور اس کے تمام اولیاء کا دشمن ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہودیوں سے پوچھا کہ میں اس کتاب کی قسم دیکر تم سے پوچھتا ہوں جسے تم پڑھتے ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تمہاری اس کتاب میں میری بشارت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام نے دی ہے کہ تمہارے پاس ایک رسول آئے گا جس کا نام "احمد" ہوگا۔ انہوں نے کہا، اللہ گواہ ہے، ہمیں معلوم ہے، لیکن ہم آپ کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ آپ مال عنیت کو حلال کرتے ہیں اور خون بہانا جائز ٹھہراتے ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ بالا نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک یہودی عمر رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہنے لگا کہ جبریل، جنکا ذکر تمہارے نبی کیا کرتے ہیں ہمارے دشمن ہیں، عمر رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا آیات کے الفاظ کے ساتھ اس یہودی کا جواب دیا اور پھر آپ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت یہودیوں کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر انہیں تنبیہ کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی، یعنی جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے تو اللہ اس کا دشمن ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ○ أَوْ كَلِمَاتٍ

اور ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضح نازل کئے ہیں اور قاعدہ کلیہ یہ کہ کوئی انکار نہیں کیا کرتا ایسی دلائل کا انکار صرف ہی لوگ جو عدول حکمی کے عاوی ہیں۔ ان لوگوں نے

عَهْدٌ وَعَهْدٌ مُّبِينٌ ○ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ طَبَلُ الْأَكْثَرِ هُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ وَ

کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اُسکو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا بلکہ ان میں زیادہ تو ایسے ہی ٹکینگے (جو میرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے۔ اور جب

لَسَاجِدًا هُمْ مَرْسُورٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٍ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَأٌ فَرِيقٍ

ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان لوگوں کے پاس ہے، یعنی تورات

مِنَ الَّذِينَ أَوْوُوا الْكُتُبَ كَتَبَ اللَّهُ وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ لَكُمُومًا لَا يَأْتُونَ

کی ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب الشری کو پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو گویا اس کے مضمون کا (اصلاً علم نہیں۔

روشن نشانات کا انکارنا فرمان ہی کر سکتا ہے

ہم نے آپ پر روشن اور واضح علامتیں اتاری ہیں جن سے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ آپ کی نبوت برحق ہے۔ یہ روشن علامتیں وہ مضامین ہیں جو قرآن مجید میں موجود ہیں اور جو متعلق یہودیوں کا یقین تھا کہ نبی کے سوا انھیں اور کوئی نہیں جانتا، یا پھر ان کے وہ علماء و احبار جانتے تھے جو اپنی کتاب اور تاریخ کے ان راز ہائے سر بستہ سے واقف تھے جن کا ذکر ان کی کتابوں میں ہوا تھا لیکن ان کے اسلاف نے ان میں تحریف تبدیلی کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام سر بستہ رازوں کو قرآن مجید میں بیان کر دیا، اگر ان کے دل میں قومی عصبیت حسد و بغض نہ ہوتا تو قرآن مجید کے واضح اور صاف بیانات ان کے ایمان کے لئے کافی ہوتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آج کی تفسیر میں روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ "آپ امی ہیں، آپ نے کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے، اس کے باوجود آپ ان کی ایک حرکت سے پردہ فاش کرتے ہیں، کیا نبی کے سوا کوئی بھی شخص ایسی باتیں بتا سکتا ہے؟" آپ سے ایک روایت میں ہے کہ ابن

صوری یا یہودی آنحضرت سے ایک مرتبہ کہا کہ آپ کی کسی بات کا ہمیں علم نہیں اور نہ آپ کوئی روشن علامت رکھتے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ "وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ" (اور ان سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا، بجز نافرمانوں کے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ پر وحی کے ذریعہ روشن علامات اتاری ہیں اور وہ سب یہودیوں کے علماء و احبار کے لئے جانی پہچانی ہیں اور اس کا نبوت ہے کہ واقعی آپ ہماری طرف سے رسول ہیں۔ اور ان آیات و علامات اور آپ کی نبوت کا انکار نافرمان ہی کر سکتا ہے۔ جسے اپنے دین اور اپنی کتاب کی بھی پرواہ نہیں۔ لیکن انھیں میں جو لوگ دیندار ہیں اور اپنی کتاب اور اپنے نبی کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے ہیں وہ میری ان آیات کی تصدیق کرتے ہیں جو میں نے آپ پر نازل کی ہیں۔ بنی اسرائیل ہی کا یہ وہ طبقہ ہے جو اللہ پر ایمان لایا تھا اور آپ کے رسالت کی تصدیق کی تھی۔

"أَوْ كَلِمَاتٍ عَاهَدُوا لَكُمْ فِي عَهْدِكُمْ لَا تُرِيدُونَ إِلَّا الْفِئْتَانِ" (اور انہوں نے جب کبھی بھی کوئی عہد کیا ہے تو انہی میں سے کسی جماعت نے توڑ ہی پھینکا ہے، اصل یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اعتقاد ہی نہیں کرتے) "عَهْدٌ" سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل سے بار بار لیا تھا کہ تورات پر عمل کرو گے، لیکن انہوں نے ہمیشہ وعدہ خلافی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں زبردستی سچ کر رہا ہے کہ تمہارے اسلاف نے جس طرح تورات پر عمل کے سلسلے میں عہد شکنی کی تھی، تم بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر کر کے انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہو۔ تورات میں آنحضرت پر ایمان کا بھی تم سے وعدہ لیا گیا تھا اور آپ کے اوصاف اس میں بیان کر دیئے گئے تھے، تم آج ان اوصاف کا انکار کرتے ہو اور انھیں چھپاتے ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو اپنے اور پر ایمان کا اللہ سے وعدہ یاد دلایا تو مالک بن صیف یہودی نے کہا کہ خدا کی قسم محمد کے متعلق ہم سے کوئی وعدہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

"نَبَأٌ" کا مفہوم ہے "پھینکنا" جو بات زبان سے نکل جائے اسے بھی "نَبَأٌ" اس مناسبت سے کہتے ہیں "نَبَأٌ" فریق منہم" کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں میں سے ایک جماعت نے اللہ کے عہد کو پھینک دیا یعنی عہد شکنی کی اور چھوڑ دیا۔ قتادہ اور ابن جریر رحمہما اللہ سے اس طرح تفسیر منقول ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان کی عہد شکنی اور وعدہ خلافی کا یہ عالم تھا کہ جو عہد بھی کرتے اسے ضرور توڑ دیتے، آج کسی سے عہد و پیمان کیا اور کل توڑ دیا یہ ان کی عادت بن چکی تھی۔ "فریق" بمعنی جماعت۔ "منہم" سے مراد بنی اسرائیل کے یہودی ہیں، "بن اکتھر منہم لا یؤمنون" یعنی یہ لوگ جن کا معمول بن چکا ہے کہ جب کوئی عہد و پیمان کرتے ہیں تو اسے انھیں میں سے ایک جماعت توڑ دیتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو ایمان نہیں رکھتے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان عہد شکنی کرنے والوں اور حق کو جھٹلانے والوں میں اکثر سرے سے ایسے پر ایمان نہیں رکھتے کہ انہوں نے کبھی اس طرح کا کوئی عہد و پیمان کیا بھی تھا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اللہ، اس کے انبیاء اور اس کے وعدہ و عہد کی تصدیق ہی نہیں کرتے اور نہ ان پر ان کا کوئی ایمان ہے۔

۱۰ لیکن دوسرے مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "آیات" عام ہیں، اس لئے اس سے قرآن مجید، معجزات کتب سابقہ پر اطلاع، قرآن کا قانونی نظام اور اس سے متعلق تمام ہی چیزیں مراد لینی چاہئیں۔ یہودی اپنے پیغمبروں کے معجزات کے عادی تھے، بار بار یہی مطالبہ کرتے تھے کہ یہ کیسے نبی ہیں، کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتے۔ ارشاد ہے کہ تم ایک نشانی کو کہتے ہو، پیمان تو متعدد نشانیاں تمہاری سامنے لائی جا چکی ہیں اور وہ بھی مخفی اور پوشیدہ نہیں بلکہ کھلی ہوئی اور روشن، لیکن تم تو کفر و انکار کے عادی ہو۔

(مسترحم)

”وَمَا جَاءَهُمْ مِنْ رَسُولٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ نَبَأٌ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَمَا

ظہورِ ہم کا تم لا یعلمون“ یعنی جب ان علماء و احبار یہود کے پاس رسول اللہ کی طرف سے آئے۔ سدی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آیت میں ”رسول“ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ”مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ“ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تصدیق کرتے ہیں تورات کی (جو ان کے پاس موجود ہے) اور تورات ان کی تصدیق کرتا ہے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی اور تمام مخلوق کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ ”وَمَا مَعَهُمْ“ سے مراد ہے وہ کتاب جو ان کے پاس ہے یعنی تورات۔ مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے آئے، کتاب الہی تورات کی تصدیق کے ساتھ جو ان یہودیوں کے پاس موجود ہے تو ”نَبَأٌ فَرِيقٌ“ یعنی ایک جماعت اس کا انکار کر بیٹھی، حالانکہ پہلے وہ خود اس کا اقرار کرتے تھے ”مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ“ یعنی انکار کرنے والے علماء یہود تھے جنہیں اللہ نے کتاب الہی کا علم دیا تھا۔ ”كِتَابَ اللَّهِ“ سے مراد تورات ہے ”وَمَا جَاءَهُمْ“ کا تعلق ”نَبَأٌ فَرِيقٌ“ سے ہے۔ یعنی انہوں نے اسے پس پشت پھینک مارا۔ یہ ایک محاورہ ہے، ہر اس موقع پر استعمال کر سکتے ہیں جب کوئی شخص کسی مفید کام کو چھوڑ دے، اعراض اور صرف نظر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ سدی رحمتہ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ”جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو انہوں نے آپ کی مخالفت کی، حالانکہ قرآن مجید اور تورات کے مضامین میں اختلاف نہیں تھا لیکن انہوں نے تورات کو بھی چھوڑ دیا اور آصف کی کتاب اور ہاروت و ماروت کے جادو کو اختیار کر لیا۔ اسی لئے ان کے متعلق فرمایا کہ ”وَمَا مَعَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ“ یعنی یہ علماء یہود جنہوں نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا ہے اور اس کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ان کا عمل ایسا ہے جیسے یہ جانتے ہی نہیں کہ انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا بھی حکم اللہ نے دیا تھا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود آنحضرت کے نبی برحق ہونے کو جانتے تھے لیکن اس کے باوجود انکار کرتے تھے۔ قتادہ رحمتہ اللہ علیہ سے یہی روایت

رعایتی اعلان

مندرجہ ذیل کتابوں پر ممبران تفسیر ابن جریر کو فی روپیہ چار آنے کی رعایت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ممبران کو دوسری کتابیں بھی ہمارے مکتبہ سے خصوصی رعایت کے ساتھ بھیجی جاتی ہیں۔

اس کتاب میں اللہ، اس کی صفات، انسان، اس کا درجہ و مرتبہ، رسالت، قرآن اور آسمانی کتابیں قیامت، ایمان و کفر طاعت و عبادت اخلاق، معاملات زندگی اور دوسرے بہت سے عنوانات پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور دکھا یا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک انسان کی زندگی میں، اس کے عقیدہ اور عمل میں قرآن مجید کی کیا تعلق ہے اور وہ کس درجہ فطری اور حق ہیں۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ پانچ آنے۔

اس کتاب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامات کی تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ خلفاء راشدین اور تمام اکابر صحابہ کے حالات و کرامات پر یہ کتاب حاوی ہے۔ آخر میں ایک جن صحابی رضی اللہ عنہ کی بھی کرامت ذکر کی گئی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ دو آنے۔

نماز کی فضیلت اس کی حقیقت، پانچوں وقت کی نمازیں کیوں فرض کی گئی ہیں۔ پانچ وقت کی نماز میں صرف سترہ رکعتیں ہی کیوں فرض ہیں؟ جماعت، اس کا حکم، اسکے چھوڑنے والے پر وعید، فرض نماز سے متعلق تمام ہی احکام پر یہ کتاب جامع ہے، وضو، غسل اور غنم کے فرائض، واجبات، سنن و مستحبات احکام کا آخر میں ذکر ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ رعایتی بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ: بیت الحکمت دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی) انڈیا

(زیر نگرانی منشی رفیق احمد بونیر پورنگ پریس دہلی)

۷۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ

تفسیر ابن جریر (اردو)

تالیف

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری

ترجمہ و تشریح

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اردو ترجمہ

ظہور الباری عظیمی

پارہ اول کا جزو دوم

شائع کردہ

بیت الحکمت دیوبند (یو۔ پی)

(جلد حقوق بنام بیت الحکمت محفوظ میں)

قیمت دو روپیے